ISSN: 2581-5482

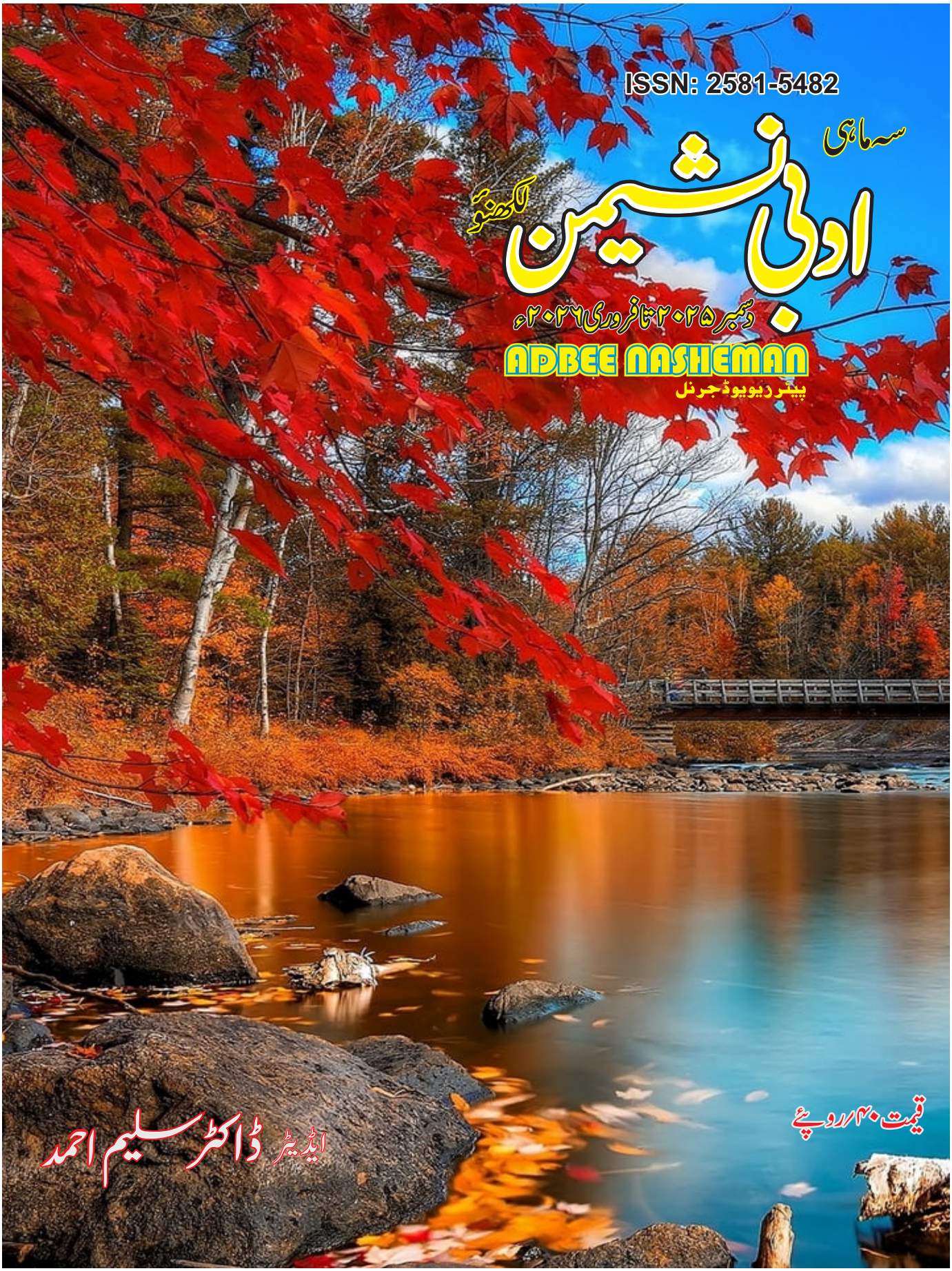
سہ ماہی

ادبی نشیمن لکھنؤ

دسمبر ۲۰۲۵ تا فروری ۲۰۲۶ء

ADBEE NASHEMAN

پیئر ریویوڈ جرنل



ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت ۴۰/روپئے



ڈاکٹر مخمور کاکوروی کے نعتیہ مجموعہ کلام ''دیار سبز گنبد میں'' کے اجراء کے موقع پر لی گئی تصویر۔



ادبی نشیمن کے دفتر میں نعتیہ مشاعرہ میں شعرائے کرام۔



بزم اردو سیتاپور کے پچپن سالہ جشن میں ابوالکلام آزاد اکیڈمی لکھنؤ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی مست حفیظ رحمانی صاحب کو ''فخرِ اردو'' ایوارڈ سے سرفراز کرتے ہوئے۔

دسمبر ۲۰۲۵ تا فروری ۲۰۲۶
ISSN: 2581-5482
جلد : ۹ شمارہ : ۱

سہ ماہی ادبی نشیمن لکھنؤ

سرپرست
ڈاکٹر عامر قدوائی (کویت)
مدیر
ڈاکٹر سلیم احمد
adbeenasheman@gmail.com
9415693119 8707260591
مدیر اعزازی
ڈاکٹر شاہد حبیب
8539054888
سرکولیشن منیجر
محسن عظیم انصاری
9451300431

ADBEE NASHEMAN

قیمت

اس شمارے کی قیمت	:	۴۰/روپے
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک:		۴۵۰/روپے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک) :		$ 25 (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵/روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

www.adbeenasheman.com
E-mail: adbeenasheman@gmail.com

اس دور میں تنہا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اپنے دم پر ادبی رسالے کو مسلسل جاری رکھ سکے اس لئے اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے تقاضے کے پیش نظر کیو آر کوڈ شائع کیا جارہا ہے تا کہ جو لوگ مالی تعاون/خریدار بننا چاہتے ہوں وہ اس پر رقم بھیج سکتے ہیں۔

ADBEE NASHEMAN
SCAN & PAY
UPI ID : adbeenasheman@indianbk

☆ ادبی نشیمن کو RNI سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ Adbee Nasheman کی اسپیلنگ کے ساتھ ملا ہے۔ اس لیے غلط ہونے کے باوجود مجبوراً یہی اسپیلنگ ہر جگہ استعمال کی جارہی ہے۔

☆ ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے خیالات قلمکاروں کے اپنے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا اختیار صرف لکھنؤ کی عدالتوں کو حاصل ہے۔

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ دسمبر ۲۰۲۵ء تا فروری ۲۰۲۶ء

آغاز

	حمد باری تعالیٰ	خالد عبادی	۳
	نعت شریف	غضنفر	۳

اداریہ

	نظریہ	ڈاکٹر سلیم احمد	۴

مضامین

۱	فکر تونسوی کی ناول نگاری	ڈاکٹر رفیق احمد	۵
۲	ڈاکٹر فضل امام کی مرثیہ تنقید	ڈاکٹر لئیق رضوی	۱۰
۳	اردو میں سہرا نگاری	ڈاکٹر امتیاز ندیم	۱۵
۴	ابوالکلام آزاد کی فکر اور موجودہ عہد کے تقاضے	ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی	۱۹
۵	فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار	ڈاکٹر بشریٰ بانو	۲۲
۶	کرشن چندر کا شہزادۂ کل اور آج	جمیلہ بی بی	۲۴
۷	انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا شاعر: ساحر لدھیانوی	محمد محتشم	۲۹
۸	رونق جمال: ایک شش جہتی فنکار	فردوس انجم	۳۵
۹	''۱۸۵۷ اردو ماخذ کے آئینے میں'': ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد حامد آفاق قریشی	۳۹
۱۰	عالم بالا سے میر تقی میرؔ کا ایک خط	ڈاکٹر شاہدہ صدیقی	۴۱
۱۱	خواجہ میر درد ایک سچے صوفی شاعر	محمد وارث	۴۴

منظومات

۱۲	نظم (اضطراب)	شعیب ندیم گورکھپوری	۱۴
۱۳	غزل	خورشید انجم پورنوی	۲۱
۱۴	غزل	لیاقت علی خان یاسر جالنوی	۳۸
۱۵	غزل	بے نام گیلانی	۴۳
۱۶	غزلیں	شہاب الدین شفیق/ اصغر شمیم	۴۶
۱۷	نظم (کینسر ہے مجھے)	نیازؔ جیراجپوری	۴۷

افسانے

۱۸	داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے ہیں	رینو بہل	۴۸
۱۹	مرضی پور کا پاسدار	ڈاکٹر عارف انصاری	۵۳

افسانچے

۲۰	غلطی	رئیس احمد کمار	۵۲
۲۱	چراغ تلے، برسر روزگار، معاوضہ	تنویر اختر رومانی	۵۹

تبصرے

۲۲	خاکوں کا نگاری خانہ	مرتب: ڈاکٹر محمد اشرف/ مبصر: ڈاکٹر محبوب حسن	۶۰
۲۳	فکر تونسوی کی ادبی و صحافتی خدمات	مصنف: ڈاکٹر رفیق احمد/ مبصر: ڈاکٹر شکیل احمد	۶۱
۲۴	جانِ شوریدہ	شاعرہ: خوشبو پروین/ مبصر: ابراہیم افسر	۶۲
	خطوط	ڈاکٹر پرویز شہریار/ ایس معشوق احمد/ عظمت علی	۶۴

حمد باری

تیری بخشش ، تیری رحمت عام ہے
دیکھ کر دل بندہ بے دام ہے

ڈھونڈتا ہوں در بہ در دیوانہ وار
سلسلہ یہ صبح سے تا شام ہے

ساتھ دنیا کے عطا کی آخرت
مہربانی ہے ، ترا اکرام ہے

اہل دنیا سے نہیں اب اس کو کام
اور ہی رنگ دل نا کام ہے

فکر منزل سے ہوا بیگانہ میں
راہ میں تیری عجب آرام ہے

دل میں پنہاں ایک تیری آرزو
لب پہ جاری ایک تیرا نام ہے

سایہ شمشیر میں سجدہ کناں
ہوں اگر میں تو ترا انعام ہے

☆☆☆

خالدعبادی
(پٹنہ۔موبائل: 9835480456)

نعت

یہ کیسا نام ہے جس سے سدا رحمت نکلتی ہے
تصور سے فقط جس کے سکوں صورت نکلتی ہے

زمانہ آج تک حیرت زدہ ہے اس حقیقت پر
کہ اک امّی کے اک اک لفظ سے حکمت نکلتی ہے

نبی ایسا کہاں کوئی کہ جس کے اک اشارے پر
عذابوں کے تلاطم سے کوئی امّت نکلتی ہے

کسی نعمت کی خواہش پھر کبھی ہوتی نہیں صاحب
محمّد کے وظیفے سے عجب لذّت نکلتی ہے

عجب دل ہے کہ جس نے سنگ پھینکا ہے محمد پر
زباں سے اس کی خاطر بھی فقط الفت نکلتی ہے

نبی چاہیں تو دربارِ خدا میں قیمتی کر دیں
وگرنہ ہم سیہ کاروں کی کیا قیمت نکلتی ہے

محمد مصطفےٰ کا دل ہی وہ دل ہے کہ جس دل سے
سبھی کے واسطے شدّت بھری چاہت نکلتی ہے

رسولِ پاک کی جب زندگی پر غور کرتے ہیں
تو اک اک گام پر ہر کام سے حیرت نکلتی ہے

چلو ہم بھی چلیں رحمت نگر میں اک ذرا دیکھیں
سنا ہے ہر کسی کی اس جگہ قسمت نکلتی ہے

☆☆☆

غضنفر
(علی گڑھ۔موبائل:7678436704)

نظریہ



ادبی نشیمن کی اشاعت کے آٹھ برس مکمل ہونے پر ہمیں بے حد مسرت ہے۔ اس طویل عرصے میں رسالہ نہ صرف پابندی اور تواتر کے ساتھ شائع ہوا بلکہ قارئین کا حلقہ بھی مسلسل وسیع تر ہوتا گیا۔ ہماری مقبولیت میں اضافہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کا اعتماد اور محبت ہمارے ساتھ ہے۔ یہ کامیابی دراصل ہمارے قارئین کی مسلسل حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ یہ قیمتی تعاون اسی جذبے اور والہانہ محبت کے ساتھ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

یومِ جمہوریہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم اور یادگاری دن ہے۔ اگرچہ ملک 15 اگست 1947 کو دوسو برس کی طویل انگریزی غلامی سے آزاد ہو گیا تھا، مگر اب بھی یہاں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (Government of India Act 1935) نافذ تھا۔ یہ صورتحال آزاد ہندوستان کی فکری اور قانونی ضروریات کے مطابق نہیں تھی۔ چنانچہ ملک کے اپنے دستور کی تیاری کے لیے 29 اگست 1947 کو ایک سات رکنی ڈرافٹنگ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس انتہائی اہم کمیٹی کی صدارت کی ذمہ داری نامور قانون دان اور دانشور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے سپرد کی گئی۔ اس کمیٹی نے دوسال، گیارہ ماہ اور اٹھارہ دن کی انتہائی محنت اور مسلسل کوششوں کے بعد ملک کا جامع دستور مرتب کر کے 26 نومبر 1949 کو دستور ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجیندر پرساد کے حوالے کیا۔ اس کے بعد 24 جنوری 1950 کو دستور کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اصل نسخے پر دستور ساز اسمبلی کے تمام ممبران نے باقاعدہ دستخط کیے۔ یہ تاریخی لمحہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک اہم واقعہ تھا کیونکہ یہاں جمہوریت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ 26 جنوری 1950 کو اس دستور کے نفاذ کی تاریخ کا انتخاب بالکل اتفاقی نہیں تھا۔ یہ تاریخ اس لیے منتخب کی گئی کہ بالکل بیس سال پہلے 26 جنوری 1930 کو انڈین نیشنل کانگریس نے پہلی بار مکمل آزادی کا باقاعدہ اعلان اور عہد کیا تھا۔ اس طرح یہ دن نہ صرف جمہوری بھارت کی علامت بن گیا بلکہ قومی شعور کی تکمیل کا بھی نشان بنا۔ یوں 26 جنوری کو یومِ جمہوریہ کے طور پر منانے کی روایت شروع ہوئی۔

تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ رائے کے اختلاف اور مکالمے نے ہماری فکری روایات کو ہمیشہ مضبوط بنایا ہے۔ دستور کی منظوری کے وقت بھی یہ بات واضح ہوئی جب مولانا حسرت موہانی نے دستور کے ڈرافٹ پر اپنے بنیادی اختلافات کا اظہار کیا۔ انہوں نے اسے برطانوی دستوری روایت کی محض توسیع قرار دیتے ہوئے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ وہی حسرت موہانی تھے جنہوں نے دسمبر 1920 میں احمد آباد کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کے مطالبے کی تجویز پیش کی تھی۔ اگرچہ گاندھی جی نے اس وقت اس تجویز کو واپس لینے کی بات کہی تھی، مگر حسرت موہانی نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے عام اجلاس میں مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا۔

دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی ہندوستان کے ہر شہری کو بنیادی حقوق اور آزادیاں حاصل ہوئیں جو کسی بھی جمہوری معاشرے کی اساس ہیں۔ ان حقوق میں مذہبی آزادی اور رواداری، اظہارِ رائے کی آزادی، اجتماع اور پرامن احتجاج کا حق جیسے اہم حقوق شامل ہیں۔ اس کے علاوہ قانون کی نظر میں تمام شہریوں کے لیے مساوات، انصاف، جان و مال کا تحفظ اور تہذیبی ولسانی شناخت کے احترام کے ساتھ باوقار شہری زندگی کی ضمانت بھی دی گئی۔ ان تمام بنیادی حقوق کی بنیاد پر ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے طور پر آج بھی اپنی تنوع بھری وحدت کا جشن مناتا ہے۔ یوں جنوری کا مہینہ ہمارے لیے دوہری خوشی اور مسرت لے کر آتا ہے۔ پہلی خوشی سالِ نو کی آمد کے ساتھ نئی امیدوں اور خوابوں کی ہے، جبکہ دوسری مسرت یومِ جمہوریہ کے موقع پر اپنے جمہوری اقدار کے ساتھ تجدیدِ عہد کی ہے۔ ادبی نشیمن کی پوری فیملی اس موقع پر تمام اہلِ وطن، اپنے تمام معزز قارئین اور محبانِ اردو کو دلی مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کرتی ہے۔ آیئے، ہم سب مل کر عہد کریں کہ علم، دانش، مکالمہ اور احترامِ انسانیت کے ذریعے اپنے معاشرے کو مزید روشن اور بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔

ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ سابقہ تمام کالمز کے ساتھ اب آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کے حوالے سے آپ کے بیش قیمت تاثرات کا انتظار رہے گا۔ شکریہ

ڈاکٹر سلیم احمد

فکرتونسوی کی ناول نگاری

ڈاکٹر رفیق احمد
(شعبۂ اردو، ڈی سی ایس کے (پی جی) کالج، مئوناتھ بھنجن۔ موبائل: 9236126977)

ناول کے فنی ارتقاء اور اس کی تاریخ وتنقید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شروع میں ناول کا لفظ لاطینی زبان میں مختلف صورتوں میں ''نئے'' کے معنی میں استعمال ہوا، بعد میں یوکیشیو نے اپنے ناول ''ڈی کیمرن'' کے مقدمے میں اسے نئے قصے کہانیوں اور تمثیلوں کے معنی دیئے، انگریزی میں ناول کو سیرت وکردار کے قصّوں کے لئے مخصوص کرلیا گیا جسے اردو والوں نے بھی اسی معنوں میں اپنالیا۔ آگے چل کر جس کے معنی و مفہوم میں وسعت وکشادگی آتی چلی گئی۔ انگریزی زبان وادب کے نامور تنقید نگار پروفیسر بیکر نے ''ہسٹری آف دی انگلش ناول'' میں لکھا ہے کہ ''ناول ایک نثری بیانیہ قصّے کے ذریعے انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے، قصّے کی کوئی کتاب اس وقت تک ناول نہ کہلائے گی جب تک وہ نثر میں نہ ہو، حقیقی زندگی کی ہو بہو تصویر یا اس کے مانند کوئی چیز نہ ہو اور ایک خاص ذہنی رجحان (نقطۂ نظر) کے زیر اثر اس میں ایک طرح کی یک رنگی وربط نہ موجود ہو''۔

پروفیسر دھارٹن کے بقول:

''ناول ایک ایسے قصے کا بیان ہے جس میں ایک پلاٹ ہو''۔

والٹر ریلے کے مطابق:

''ناول وہ ہے جس کا موضوع روزانہ زندگی ہے اور جس کا ذریعہ حقیقت نگاری ہے''۔

مشہور انگریزی ناول نگار فیلڈنگ کا خیال ہے کہ:

''ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے''۔

فیلڈنگ کے ہمعصر ناول نویس اسمولٹ نے ناول کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں ایک مقررہ پلاٹ کے واضح کرنے کے لئے زندگی کے کردار مختلف جماعتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے جاتے ہیں''۔

عہد وکٹوریہ کا مصنف اسٹونس ناول کی تعریف اس الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''ناول ایک ایسی نقل نہیں کہ اس کا فیصلہ اصل پر رکھ کر کیا جائے بلکہ وہ زندگی کے کسی خاص پہلو یا نکتۂ نظر کی وضاحت ہے اور اس کی فنا وبقا اسی وضاحت کی اہمیت پر مبنی ہے۔ ایک اچھا لکھا ہوا ناول اپنے مقصد وغرض کو اپنے ہر باب، ہر صفحے اور ہر جملے سے پکارتا اور دہراتا ہے''۔ ناول نثر میں قصہ بیان کرنے کا فن ہے''۔

انگلستان کی ایک نامور ادیبہ کلارا ریوز ناول کے فن کی تعریف اس طرح کرتی ہے:

''ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے''۔

''فرانس کے فطرت نگار زولا کے بقول'':

''ناول خیالات انسانی کا تجزیہ ہے اور ان کے مظاہر کا ایک رکارڈ ہے''۔

پولینڈ کے باشندہ انگریزی ناول نگار کانریڈ نے لکھا ہے کہ

:''ایک ناول اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہمیں اس کے ذریعے دوسرے انسانوں کے وجود کا یقین آجاتا ہے اور اس یقین میں اتنی شدت پیدا ہوجاتی ہے کہ ہم اسے تخیلی جامہ دے کر حقیقت سے بھی زیادہ واضح بنادیتے ہیں''۔

''دی ناول ان انگلش'' کے مصنف گرانٹ سی نائٹ کے بقول:

''ناول ایک حقیقت نگار نثری قصہ ہے''۔

بریسٹلی کا خیال ہے کہ:

''ناول زندگی کے لئے ایک آئینے کے فرائض انجام دیتا ہے''۔

مسٹر مور لکھتا ہے کہ:

''ناول زمانۂ موجودہ کی تاریخ ہے اور اس عہد کی کامل ترین تصویر جس میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں''۔

مشہور ناول نگار اور ڈرامہ نویس آرنلڈ بنٹ نے لکھا ہے:

''ناول نگار وہ ہے جو زندگی کا غائر مطالعہ کرے اور اس سے اس قدر متاثر ہو کہ وہ اپنے مشاہدے کا حال دوسروں سے بیان کئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنے جذبات کے اظہار کے لئے قصہ گوئی کو سب سے زیادہ موزوں ومناسب ذریعہ وآلہ سمجھے۔

(''اردو ناول کی تاریخ اور تنقید''۔علی عباس حسینی۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ،مطبوعہ ۱۹۹۰ء ص ۳۸)

صحیح معنوں میں ناول زندگی کی تصویر یا اس کی شبیہہ ہے، ناول زندگی کا راست اور شخصی تاثر بھی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کا خیال ہے کہ:

''ناول قصہ ہوتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں''۔

ناول کی مذکورہ تعریف کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم فکر تونسوی کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ فکر کی ناول میں فنی محاسن کا فقدان پایا جاتا ہے، ان کی ناولوں میں فنی ہیئت موجود نہیں ہے، ناول نگاری کے لئے جو فنی اصول وضوابط ہونے چاہئیے ان سے فکر کی ناولیں بہت دور ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ فکر تونسوی کا شمار اردو کے کمتر ترین ناول نگاروں کی فہرست میں بھی نہیں ہوتا ہے۔

ہماری فہم کی حد تک اس کی بنیادی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ فکر تونسوی کی ناولیں فنی نقطۂ نظر سے کوسوں دور ہیں دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فکر تونسوی ہر فن مولا فنکار بننے کی غرض سے ناول نگاری کے میدان میں بلاوجہ کود پڑے جس میں ان کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ بسیار نویسی کی عادت نے ان سے اردو کے چار غیر معیاری ناول لکھوا ہی لئے۔جس پر فکر تونسوی کو تو اپنے ناول نگار بننے کا بجا طور پر فخر ہوسکتا ہے مگر اردو ناول نگاری کی تاریخ میں فکر تونسوی کا شمار ابتک ناول نویس کی حیثیت سے نہ ہوسکا اور نہ ہی آئندہ اس کی کوئی امکانی صورت نظر آرہی ہے۔

فکر تونسوی اردو طنز ومزاح نگاری اور ظریفانہ صحافت کے بے تاج بادشاہ ہیں۔قلم کے اس مزدور نے تفریح طبع یا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے سطحی اور غیر معیاری ناول تو ضرور لکھ ڈالی مگر وہ اس فیلڈ میں بری طرح فلاپ ہوگئے جس کا احساس ان کو بھی تھا کیونکہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا طنز نگار ناول نویسی کی دنیا میں بھی سرخرو ثابت ہو۔فکر کی ناولوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ناول نگاری کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہیں ۔ ناول کے اجزائے ترکیبی کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم فکر کی ناولوں کا باریک بینی سے تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ بہ حیثیت ناول نویس فکر کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار نہیں ہوسکے۔

فکر تونسوی کے مداح اور پرستار سید نصیر الدین احمد بوگس حیدر آبادی نے ان کی ناول نگاری کے بارے میں لکھا ہے:''فکر نے کئی طنزیہ ناول لکھے ہیں جیسے''پروفیسر بدھو''،''چوپٹ راجہ''''ماڈرن علاء الدین''''چاند اور گدھا'' وہ ایک اور ناول''پنجاب کو سلام'' کے نام

سے لکھ رہے تھے جو کبھی شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آیا۔

فکر کے ناول شروع سے آخر تک زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طنز کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں، ان کے ناول کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ ناول نگار کی حیثیت سے فکر کا نام اب تک نہیں لیا جاتا۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طنز کرنے کے لئے فکر ایک کہانی کا سہارا لیتے ہیں اور کسی کردار کی زندگی کے مختلف واقعات کو اپنے طنز میں پرو کر ناول کی شکل دیتے ہیں۔ اصل میں وہ اپنے طنز کے پھیلاؤ کو ناول کا نام دیتے ہیں فکر نے یوں تو کئی ناول لکھے ہیں لیکن ان کی ناولوں میں ''پروفیسر بدھو'' ہر لحاظ سے ان کا ایک نمائندہ ناول کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں فکر کا طنز کافی بھرپور اور نمایاں شکل میں ابھرتا ہے اس ناول کا موضوع اصل میں ایک دانشور کی نصب العینی محبت ہے۔

پروفیسر بدھوا اپنی اس تخیلی محبت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور اس کی اسی تلاش میں اس کا کردار بھی نمایاں ہوتا ہے۔ فکر نے اس ناول میں خود آدرش عشق کے تصور کا بھی ایک طرح سے مذاق اڑایا ہے اور یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ زمانے میں آدرش مثالی عشق پیش کرنا بڑا مشکل ہے۔ ناول کی ابتداء اصل میں ناول نگار اور اس کے ایک دوست کے مباحثے سے شروع ہوتی ہے۔ دوست جو ناول نگار نہیں ہے اپنے ناول نگار دوست سے عاشقانہ ناول لکھنے کی فرمائش کرتا ہے۔ ناول نگار دوست کہتا ہے:

''عشق کا ناول لکھنا ناممکن ہے اس کی وجہ
یہ ہے کہ ہیرو نہیں ملتا''۔

(''پروفیسر بدھو'' فکر تونسوی۔ مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۱ء۔ ص ۱۰)

اور پھر اپنے دوست کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ اس موضوع پر ناول لکھ کر دکھا دے، طنزیہ کہتا ہے: ''تاکہ آنے والی نسلیں آپ پر تو کم از کم ناراض نہ ہوں''۔ اور یوں غیر ناول نگار دوست اس چیلنج کی وجہ سے ناول نگار بن جاتا ہے اور اس طرح سے ناول شروع ہوتا ہے، ناول میں سب سے پہلے ہیرو کی جستجو ہوتی ہے کیونکہ ناول نگار دوست کا دعویٰ یہی تھا کہ عاشقانہ ناول اس زمانے میں لکھنا اس کے لئے مشکل ہے کیونکہ کوئی عاشق نہیں ملتا۔

یہاں فکر نے عاشق کے نہ ملنے پر موجودہ حالات پر طنز کیا ہے۔ جیسا کہ اس نے ساتھی سے کہا تھا ''عشق میں اتنا قحط پڑا تھا کہ لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے'' اس طرح سے گویا ناول نگار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ایسے دور میں کوئی سچا عاشق کس طرح مل سکتا ہے لیکن غیر ناول نگار دوست کو اپنے ناول کے لئے پروفیسر بدھو جیسا عاشق مل ہی جاتا ہے۔ یہاں بھی دوہرا طنز کیا گیا ہے پہلی بات تو یہ کہ کوئی بدھو ہی اس زمانے میں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو عشق جیسے فضول کام میں نکما پن کا ثبوت دے سکتا ہے اور دوسری بات یہ کہ اس بدھو کو بھی اپنے عشق کو قائم و دوائم رکھنے کے لئے پروفیسر بدھو ہونا ضروری ہے گویا بغیر غائب دماغی کے نہ عشق ہو سکتا ہے اور نہ عشق کی سرگرمی کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔

ناول کا ہیرو پروفیسر بدھوا اپنے ہیرو (کردار) کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اس ہیرو کی تلاش میں وہ جن جن واقعات، جن جن لوگوں سے زندگی کے دردناک اور کربناک پہلوؤں سے گزرتا ہے، سماجی ناانصافی اور سماج کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو جس طرح دیکھتا ہے معاشرے کے ناہموار پہلوؤں کو جس طرح شدت سے محسوس کرتا ہے اور مختلف حالات میں انسانی فطرت کے نشیب و فراز سے جس طرح انسان گزرتا ہے ان سب کی تصویر اس ناول میں ملتی ہے۔

انسان اور اس کے کردار کے معیوب اور احمقانہ پہلو پر کی جانے والی ادبی تنقید کو طنز کہا جا سکتا ہے۔ پروفیسر کے پاس بھی طنز کی خصوصیت ملتی ہے اور خاص طور پر ان کے ناولوں پر یہ بات حرف بہ حرف صادق آتی ہے کہ ان کے ناول کا ہر کردار یا تو کوئی نہ کوئی احمقانہ پہلو رکھتا ہے یا اپنے کردار میں کوئی نہ کوئی عیب رکھتا ہے، فکر اپنے ناولوں میں انسان کی ایسی حماقت اور اس کے عیوب کی پردہ داری کرتے ہیں خاص طور پر دولت اور دولت کی حرص رکھنے والوں پر ان کا طنز تیکھا ہو جاتا ہے۔ دولت کی اس ہوس پر طنز کرتے ہوئے وہ اپنے ایک کردار مصرا کی حالت زار بتاتے ہیں، ناول کا ایک کردار مصرا پروفیسر بدھو کو اپنے حالات سناتا ہے اور سنانے کے بعد اس کی محبوبہ اس سے محبت کرنا بھول جاتی ہے اور جب پروفیسر بدھو پوچھتا ہے کہ وہ کیوں بھول گئی کیا اس کا حافظہ کمزور تھا تو اس کے جواب میں مصرا

پروفیسر بدھو سے کہتا ہے:

''ہاں شاید حافظہ ہی کمزور تھا کیونکہ شادی کے بعد محبت کے بجائے اس نے یہ کہنا شروع کر دیا ، پیارے کھانا وقت پر کھایا کرو اور وقت پر کھانا جب ہی کھایا جاتا ہے، اگر تم باقاعدہ بزنس شروع کر دو ۔ پروفیسر صاحب دراصل اس کی ماں ایک دولت مند بیوہ ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں دس ہزار روپیہ لگا کر دریا سے مچھلیاں برآمد کرنے کا ٹھیکہ لے لوں چنانچہ ایک ہی سال بعد میں نے محسوس کیا کہ میری خوش دامن صاحبہ نے اپنی حسین بیٹی میرے ساتھ نہیں بیاہی بلکہ مچھلیوں کے کسی بڑے بھاری جال کے ساتھ بیاہی ہے اور وہ اب اپنے داماد کی ذہانت کو مارکٹ میں بیچنا چاہتی ہے، بالکل ویسے جیسے مچھلیاں بیچی جاتی ہیں اور ایسے ہی بیچی جاتی ہے جیسے ٹین کی چادریں بیچی جاتی ہیں''۔

(''پروفیسر بدھو''۔ص۵۹)

ناول کا مرکزی کردار پروفیسر بدھو آئیڈیل عشق کی تلاش میں حسن سے بھرے بازار کی سیر کرتا ہے اور مختلف شکل وشباہت کی حامل مثالی محبوباؤں اور معشوقاؤں کے دلکش حسن و شباب کے جال میں پھنس جاتا ہے، حسن کی طلب اور دولت کی ہوس نے زندگی کے میدان میں اسے کافی آگے تک پہونچا دیا۔ مثالی عشق میں کامیابی کے ساتھ ہی وہ دولت وثروت کے سہارے اپنی من چاہی خواہشات کی تکمیل کرتا ہے اور اسے اس بات کا شدید احساس بھی رہتا ہے کہ دولت سے ہر چیز تو حاصل کی جاسکتی ہے مگر ضروری نہیں کہ اس سے انسانی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہو۔

پروفیسر بدھو کا احساس دھوکہ اور فریب کی زندگی سے شدید ہوتا جارہا ہے اور وہ مختلف جگہوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے غریبوں کی اس بستی میں پہونچتا ہے جہاں اسے سچا خلوص اور پیار ملتا ہے اور آخر میں وہ ایک مفلس اور پاگل لڑکی سے عشق بھی کرتا ہے اور اس سے شادی بھی رچالیتا ہے، اس طرح فکر تونسوی کا طنزیہ ناول پروفیسر بدھو مختلف زندگی کے پہلوؤں پر گہرا طنز کرتے ہوئے اختتام کو پہونچتا ہے''۔

(''فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری''۔ بوگس حیدر آبادی، مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۸۰ ص ۱۲۷)

فکر تونسوی کا یہ ناول حقیقی معنوں میں ناول کے اسلوب اور فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اس میں ناول کے محاسن کم اور طنز کے تیر ونشتر کچھ زیادہ ہی ملتے ہیں ناول کا پلاٹ تو ٹھیک ہے مگر اس میں مکالمہ، کردار اور منظر نگاری کے جوہر کم دکھائی دیتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی فکر کے ناول پروفیسر بدھو کو ناول کی فہرست میں تو شامل کیا جاسکتا ہے مگر اسے اردو کا نمائندہ ناول ہرگز نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس ناول میں فنی نکتہ نظر سے بہت جھول اور کمی نظر آتی ہے۔

اردو کے نامور ادیب و دانشور ڈاکٹر ایس جے صادق نے ،فکر تونسوی کے ناول پروفیسر بدھو'' کا تنقیدی و تفصیلی جائزہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے: ''فکر تونسوی نے ماہنامہ ''شاہراہ'' دہلی کی ادارت سنبھالی تو مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی سے ان کا طنزیہ ناول ''پروفیسر بدھو'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔

پروفیسر بدھو ناول کا ہیرو ہے اگرچہ عشق کی تلاش میں اپنے کتّی ڈبو کے ساتھ بدھی پور پہنچتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک آنکھ والے چھوٹے بابو سے ہوتی ہے جو رائے صاحب کی سپلائی شدہ روٹی حاصل کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگانا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے سڑک پر بیٹھا ہوا ہے۔ رائے صاحب انسان اور کتّی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ان کا خیال یہ ہے کہ ہر جیو بھگوان کا پیدا کیا ہوا ہے اسی لئے ہر جیو برابر ہے، چھوٹے بابو جو کہ چارپائی بننے کا کام کرتے ہیں اپنے چچا کی لڑکی سے پیار کرتے ہیں۔ چھوٹے بابو کی بہن کا نام نامّو ہے۔ یہ پگلی ہے اس کے ساتھ اس کے چچا نے اپنا منہ کالا کیا تھا، اس کے پاگل پن کی اصل وجہ یہی ہے، چھوٹے بابو کے ساتھ پروفیسر بدھو کھا نمبر ۱۳ پہونچتا ہے۔ جو شمشان روڈ پر اس جگہ واقع ہے جہاں انسان اور سور ایک ہی سیدھ میں چلتے ہیں، یہ کھولی اور چند دوسرے کرداروں کی مشترکہ قیام گاہ ہے، ارسطو اور افلاطون کا چیلا مصرا بھی یہیں رہتا ہے، محبت کے معاملے میں وہ عنینیت پسند واقع ہوا ہے، وہ محبت کرنا چاہتا تھا کہ اس کی شادی اس کی محبوبہ سے کردی جاتی ہے اسے روپیہ کمانے کی

مشین سمجھنے والے دولت مند سسرال کو جنون کی حد تک عشق کرنے والی بیوی کو چھوڑ کر وہ کھوکھے (جھونپڑی پٹی) میں سکونت اختیار کر لیتا ہے اور اپنے رئیسانہ ماحول میں واپس جانا نہیں چاہتا، کھوکھا نمبر ۱۳ میں ایک عجیب سی سرانڈ بس گئی تھی وہاں کی ہر چیز ایک باقاعدہ بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھی اور ہر بے ترتیب شئے مٹی کی تہوں سے آئی ہوئی تھی۔

پروفیسر بدھو عشق کی تلاش میں نکلا ہوا ایک مسافر ہے ادھ تنگی، بھیک منگی، جسم کا کاروبار کرنے والی عورتیں تو اس سے ملتی ہیں۔ مگر محبوبہ نہیں ملتی آخر میں وہ سوچتا ہے کہ مجھے محبوبہ تو نہیں ملی کچھ روپیہ ہی حاصل ہو جائے جس سے کھوکھے میں رہنے والوں کی حالت سدھار سکوں۔ جیسے چھوٹے کی بہن کا علاج، چنی کے ساتھ اس کی شادی وغیرہ، وہ سوچتا ہے کہ اسے فوراً روپیہ کمانے کی سبیل نکالنی چاہیے۔

ناول کی ابتداء عشق کی تلاش سے ہوتی ہے فکرؔ بڑے رمزیہ انداز میں پروفیسر کو عشق کی تلاش کرتا ہوا دکھاتے ہیں وہ اس ناول میں دلچسپ ماحول پیدا کرنے سے قاصر ہیں، بیجان کردار اور مزاح کی کمی کے باعث ناول کو کسی بھی حیثیت سے خصوصیت حاصل نہ ہو سکی، یہ طنزیہ ناول تعذیلی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اس کے کردار علامت بن جاتے ہیں، جیسے نکٹے اور بابو، دونوں میں ذاتی دشمنی نہیں ہے، نفرت، مخالفت، کچھ بھی نہیں مگر پھر بھی ایک دوسرے کو اس واسطے مار پیٹ رہے ہیں کہ ان کے مالکوں کا حکم ہی ہے سرمایہ دار اور رئیس ان دونوں کو لڑا رہے ہیں کشمکش، کلائمکس، تناسب، ہم آہنگی، اتحاد، ڈرامہ، سسپنس، کردار نگاری، مزاح، طرز ادا، پلاٹ، کہانی کوئی بھی تو چیز اس قابل نہیں ملتی، اس غیر دلچسپ قصہ میں قاری دلچسپی نہیں لے سکتا۔

فکر تونسوی کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے ہمیں یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ بہ حیثیت ناول نویس فکر تونسوی ناکام رہے ہیں جہاں تک ان کے ناول نگار ہونے کا سوال ہے تو صرف اس سلسلہ میں اردو ناول کی تاریخ و تنقید لکھنے والے دانشوروں اور محققین نے بھی فکر کو ناول نگاری کی تاریخ میں کوئی مقام نہیں دیا ہے اور اس تعلق سے وہ حق بجانب ہیں کیونکہ فکر تونسوی ناول نویسی کے میدان کے شہسوار کبھی نہیں رہے ہیں، انہوں نے نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ناول نگاری تو ضرور کی مگر وہ اس میں فلاپ ہو گئے۔

فکر تونسوی کی ناول نگاری کے تعلق سے یہ بات بھی انتہائی اہم اور قابل ذکر ہے کہ سید نصیر الدین احمد بوگسؔ حیدر آبادی نے اپنی کتاب ''فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری'' میں فکر کے چار طنزیہ ناولوں ''پروفیسر بدھو'' ''چوپٹ راجہ'' ''ماڈرن علاء الدین'' ''چاند اور گدھا'' کا ذکر کیا ہے اور ایک غیر مطبوعہ ناقص ناول ''پنجاب کو سلام'' کا بھی ذکر کیا ہے اور صرف ''پروفیسر بدھو'' نامی ناول کا مختصر تجزیہ پیش کیا ہے، باقی ناولوں کے بارے میں وہ ایک سطر بھی لکھنے سے قاصر ہیں جب کہ انہوں نے اپنی کتاب فکر تونسوی جب باحیات تھے تب لکھی تھی ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بوگسؔ نے فکر کی ناول نگاری کے تعلق سے تلاش و جستجو اور تحقیق میں دلچسپی نہیں لی، ورنہ وہ ''چوپٹ راجہ'' نامی فکر تونسوی کی ایک مسلسل سیاسی طنزیہ تخلیق کو ناول نہیں لکھتے۔

واضح رہے کہ ''چوپٹ راجہ'' قطعی ناول نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی طنزیہ تخلیق ہے جو لالہ راجپوت اینڈ سنز پبلشرز دہلی سے کتابی شکل میں ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی اس پر تفصیلی گفتگو ہم تیسرے باب میں کر چکے ہیں۔ فکر تونسوی کی ایک طنزیہ و مزاحیہ تخلیق ماڈرن الہ دین یا ایک اور الہ دین چراغ کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی بوگسؔ نے اسے بھی ناول کہا ہے، جو سراسر غلط ہے اور اس کا نام بھی غلط ماڈرن علاء الدین لکھا ہے۔ فکر تونسوی کی مزاحیہ اور طنزیہ کتاب ''چاند اور گدھا'' استقلال پریس لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی جو کل دو سو چودہ صفحات پر مشتمل ہے۔

افسوس کہ بوگسؔ حیدر آبادی نے اس کتاب کو بھی ناول شمار کیا ہے، موصوف نے فکر کے ایک نامکمل اور غیر مطبوعہ ناول ''پنجاب کو سلام'' کا بھی ذکر کیا ہے ہماری اب تک کی تحقیق کے مطابق اس نام سے فکر نے کوئی بھی ناول لکھنے کا آغاز ہی نہیں کیا تھا اس لیے اس کے مکمل یا نامکمل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، ہماری دانست کے مطابق فکر نے کہیں بھی اپنے اس ناول کا ذکر ہی نہیں کیا ہے اور نہ ہی فکر کے علمی اثاثہ میں ان کے بیٹے پھول کمار بھاٹیہ جی کے پاس ''پنجاب کو سلام'' کے نام سے کوئی مسودہ یا ناقص تحریر موجود ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر فضل امام کی مرثیہ تنقید

ڈاکٹر لئیق رضوی

(نوئیڈا، اتر پردیش)

پروفیسر (ڈاکٹر) فضل امام رضوی ہمارے عہد کے ان معدودے چند ادیب، مفکر اور دانشور تھے جنہوں نے زبان و ادب کے بیشتر علاقوں میں اپنی جداگانہ فکر و نظر یے کی چھاپ چھوڑی ہے۔ ایک دیانتدار محقق، ایک معتبر نقاد، ایک بارعب مگر انتہائی شفیق استاد اور ان سب سے اوپر ایک بڑے انسان۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی علمی کاوشوں اور تحقیقی اور تنقیدی بصیرت سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ ایک نئی سمت عطا کی۔ ان کے قلم نے اردو زبان و ادب کے بہت سے گوشوں کو منور کیا اور اپنے علمی سرمایے کے ذریعے ایک دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کی خدمات اور ان کی شخصیت اردو ادب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، جسے آنے والی نسلیں بھی قدر و احترام سے یاد کرتی رہیں گی۔ ان کی ادبی روشنائی میں ایک خاص قسم کی تہذیبی لطافت اور فکری گہرائی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر سید فضل امام رضوی نے یکم اگست 1940 کو اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے ایک تعلیمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی۔ ڈاکٹر فضل امام بچپن سے ہی شعر و ادب میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ گورکھپور یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے درس و تدریس کی دنیا میں قدم رکھا اور تقریباً 56 برس تک مختلف جامعات میں طلبا کو اردو زبان و ادب کی تعلیم دی۔ آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز بلرام پور (یوپی) کے ڈگری کالج سے ہوا اور پھر 1972 میں وہ یونیورسٹی آف راجستھان (جے پور) چلے گئے جہاں آپ 1986 تک رہے۔ 1986 میں ڈاکٹر فضل امام الہ آباد یونیورسٹی میں آ گئے اور 2006 میں صدر شعبہ کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ یہاں آپ نے چیف پراکٹر، وارڈن اور لائبریرین کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ 31 اگست 2020 کو مختصر علالت کے بعد لکھنؤ میں وفات پائی۔ ہائے استاد گرامی! پانچ برس گزر گیے آپ سے بچھڑے۔

ایک مدرس کے طور پر ڈاکٹر فضل امام کا کریر بھی بہی تابناک ہے۔ ان کا شمار اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے نئی نسل کو مطالعہ اور تحقیق اور تنقید کی طرف متوجہ کیا۔ وہ نہایت شفیق، محنتی اور اپنے علم کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مخلص تھے۔ وہ رسمی استاد نہیں بلکہ اپنے شاگردوں کے لیے وہ ایک رہنما اور مربی کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی نگرانی میں چالیس سے زائد اسکالرز نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کے بیشتر شاگرد آج مختلف جامعات میں تدریس و تحقیق کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، جو ان کے علمی فیض و برکات کا تسلسل ہے۔ ڈاکٹر فضل امام کی شخصیت میں ایک خاص سنجیدگی، متانت اور علمی وقار تھا۔ ان کے ہاں علمی سخت گیری کے ساتھ ساتھ تہذیبی نرمی بھی ملتی تھی۔ ان کی محفلیں علمی گفتگو اور تنقیدی بصیرت سے جگمگاتی رہتیں۔

ڈاکٹر فضل امام کی تحقیقی اور تنقیدی کائنات بھی بہت گراں مایہ ہے۔ ساٹھ برس کے اپنے اس سفر میں انہوں نے اردو اور ہندی میں 75 سے زائد کتب تصنیف اور ترتیب دیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر 800 سے زائد گراں قدر مقالے بھی لکھے۔ ان کی تحریریں ادبی تاریخ، ادبی تحقیق اور ادبی تنقید اور تدریسی تجزیوں پر مبنی ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام کی خدمات کا دائرہ نہ صرف اردو زبان و ادب بلکہ ہندوستانی معاشرتی اور تحقیقی منظر نامے میں بھی نمایاں ہے۔ ان کا شمار اردو ادب کے سنجیدہ محققین اور ماہرین میں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام کی ادبی تحریروں میں قاری کو ایک ایسی تابناک روشنی ملتی ہے جو تحقیق کی باریک بینی اور تنقید کی گہرائی سے جنم لیتی ہے۔ ان کے مضامین محض تعلیمی سطح پر نہیں بلکہ ادبی ذوق رکھنے والے عام قاری کے لیے بھی یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ بطور محقق ان کی خصوصیت یہ رہی کہ وہ حوالوں کے ساتھ

استدلالی انداز میں اپنی بات رکھتے ہیں۔ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب کی کلاسیکی روایت سے بخوبی واقف تھے، اور جدید رجحانات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

ڈاکٹر فضل امام کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع اور رنگا رنگ ہے۔ان کے موضوعات میں کلاسیکی شعر و ادب، لسانیات، علاقائی ادب اور جدید ادبی رجحانات شامل ہیں۔ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو سنجیدگی، سلیقہ اور دیانت ہے، جس کا عکس ان کے ہر مضمون اور ہر جملے میں جھلکتا ہے۔آپ کی تحریریں نہ صرف اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ ان میں تحقیقی معیار اور تنقیدی بصیرت کی ایک دنیا بھی آباد ہے۔اپنی بات کے ثبوت میں انہوں نے ہمیشہ مستند تحقیقی حوالوں کے ساتھ مضبوط استدلال بھی پیش کیا ہے۔ادبی دیانت داری ان کے ادبی مطالعوں کا خاصہ ہے۔وہ تحریر میں جانبداری کے قائل نہیں تھے۔ان کے مضامین میں خلوص، شفافیت اور تحقیقی دیانت جھلکتی ہے۔ناقد کے طور پر بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ان کا تنقیدی زاویہ محض خامیوں اور خوبیوں کی نشاندہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ کسی فن پارے کے سماجی، تہذیبی اور فکری پس منظر کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ڈاکٹر فضل امام عہد حاضر کے نظریہ ساز ناقدین میں شمار ہیں۔انہوں نے شعر و ادب کی تنقید ہی نہیں کی، بلکہ وہ تنقید کے آداب و اصول پر بھر گراں قدر عبارتیں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔مغربی بالخصوص مارکسی تنقید کے دور دورے کے دوران انہوں نے مشرقی اصول تنقید پر زور دیا ہے۔مشرقی شعور تنقید اور معیار اور کسوٹیوں کی اہمیت و افادیت سے آگاہ کیا ہے۔ڈاکٹر فضل امام تنقید میں تخلیقی عمل اور دیانت داری کے قائل ہیں اور وکیل بھی۔خود لکھتے ہیں:

> 'کوئی بھی تنقید اس وقت تک معتبر نہیں ہو سکتی جب تک نقاد تخلیقی عمل سے واقف نہ ہو۔تخلیقیت ہی انتقادی شعور عطا کرتی ہے۔دراصل ایک اچھا تخلیق کار ایک اچھی تنقید کی نشاندہی کرتا ہے۔'(افکار و نظریات)

ڈاکٹر فضل امام کو اردو شعر و ادب کے علاوہ وہ ہندی کے شعر و ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی۔وہ نہ صرف انہیں پڑھتے تھے بلکہ اس سے حاصل نتائج کو اردو قارئین کے ساتھ بانٹتے بھی تھے۔آپ کی تصنیف 'جدید ہندی شاعری: سمت و رفتار' (1975) اس سلسلے کا روشن نقش ہے جو اردو برادری کو وہ اس دور کے ہندی شعر و ادب کے فکر و فن اور شعری رویوں سے روشناس کراتا ہے۔ڈاکٹر فضل امام کا ایک اہم مضمون 'سنسکرت ڈراموں' کا احاطہ بھی کرتا ہے۔آپ نے علاقائی زبان و ادب پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ان میں بھوجپوری اور راجستھانی زبان و ادب کے بعض پہلوؤں پر ان کی کتابوں ('بھوجپوری ادب کا تعارف' اور 'راجستھانی زبان و ادب: ایک تعارف' کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔اردو کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہندی میں بھی خامہ فرسائی کی اور کئی یادگار کتابیں منظر عام پر آئیں۔' اردو ساہتیہ ایک جھلک میں' اور 'پاکستان کا پرترودھی ساہتیہ (احتجاجی ادب) اس کی روشن دلیل ہیں۔

ڈاکٹر فضل امام نے زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر انتہائی اہم تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے لیکن اس مضمون میں آپ کی مرثیہ تنقید پر گفتگو مقصود ہے۔ڈاکٹر فضل امام ہمارے عہد کے معتبر اور مستند ناقد ہیں جنہوں نے رثائی شعر و ادب بالخصوص اردو مرثیہ کو ادبی تنقید کا موضوع بنایا۔مرثیہ شناسی کے باب میں ڈاکٹر فضل امام کا مرتبہ ایک بلند پایہ علمی، تحقیقی اور ادبی رہنما کا ہے جنہوں نے اردو مرثیہ کی تاریخ، اس کے طرز، معروضات، فکری اور فنی نیرنگیاں اور مختلف صاحب طرز مرثیہ گو شاعروں کے فن کو گہرائی سے جانچا اور پیش کیا ہے۔ڈاکٹر فضل امام نے فنِ مرثیہ کے ادبی و سماجی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا۔

ڈاکٹر فضل امام نے اردو مرثیہ کے ارتقاء کو عربی و فارسی مرثیہ نگاری کے پس منظر میں بھی دیکھا اور سمجھا ہے۔جس نے اردو مرثیہ کی فکری اور فنی صورتوں کو اجاگر کرنے اور ادبی قدر و قیمت متعین کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ان کی عبارتیں مرثیہ کے عام قاری ہی نہیں نقادوں اور محققین کی نئی نسل کے لیے بھی ایک معتبر حوالہ ہیں جو اس صنف کی گہرائیوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ڈاکٹر فضل امام نے مرثیہ کو

محض ایک جذباتی یا مذہبی اظہار کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اس کی ادبی و فنکارانہ جہتوں کو اجاگر کیا جس سے اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ اور ترقی کا ایک روشن باب سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر فضل امام کے مطابق مرثیہ دراصل انسان کی ابدی جدوجہد کا استعارہ ہے۔

ڈاکٹر فضل امام نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی کہ مرثیہ محض کربلا کی جنگی روداد نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب کی ایک ادبی دستاویز ہے۔ اس میں ہندوستانی سماج کی زبان، محاورے، تہذیبی اقدار اور جذبات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔اس تناظر میں مرثیہ ایک طرح کا تاریخی و تہذیبی مرقع ہے۔ڈاکٹر فضل امام اردو مرثیہ کی عصری معنویت کے بھی قایل اور وکیل تھے۔ان کے مطابق مرثیہ صرف مذہبی جذبے تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ظلم کے خلاف احتجاج اور انسانی اقدار کے دفاع کی علامت ہے۔ان کے نزدیک مرثیہ کی عصری معنویت یہی ہے کہ یہ ہمیں ظلم کے مقابلے میں صبر، قربانی اور حق گوئی کی تعلیم دیتا ہے۔ڈاکٹر فضل امام کے نزدیک مرثیہ محض ماتمی شاعری یا غمگساری کا اظہار نہیں بلکہ ایک جامع ادبی صنف ہے۔وہ اسے اردو شاعری کا سب سے طاقتور رنگ و روپ قرار دیتے ہیں جس میں جذبات، تاریخ، ثقافت اور سماجی شعور یکجا ہو کر سامنے آتے ہیں۔خود لکھتے ہیں:

''اردو مرثیہ دراصل ایک ایسی نظم ہے جس میں ہر لحظہ زندگی اور زندگی کی قوت درکار ہے ۔مرثیے نے زبردست لسانی خدمت بھی انجام دی ہے اور یہ صنف سخن اس وقت عالم وجود میں آتی ہے جب غزل اپنے انتہائے عروج پر پہنچ کر مائل بہ انحطاط ہونے لگتی ہے۔مثنوی نگاری کا سحر کام کر چکتا ہے، قصیدہ اپنے تمام تر شوکت و حشم کے ساتھ قعر مذلت میں گر جاتا ہے ۔اظہار خیال اور وضاحت جذبات و احساسات کے لئے اس وقت کی مروجہ اصناف سخن کی قبائیں تنگ ہو جاتی ہیں تو اردو مرثیہ ایک پھول کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھنے کی صلاحیت لے کر مطلع ادب پر نمودار ہوتا ہے ۔مرثیہ کی بدولت ہی مذہب ، اخلاق ، فلسفہ ، نفسیات اور طب کی ہزاروں اصطلاحات اردو شاعری کو نصیب ہوئیں ۔مرثیے نے رزم و بزم کی مختلف کیفیات کو اردو میں نظم کرنے کی صلاحیت اور شعور بخشا ہے۔تشبیہات و استعارات ، تلمیحات اور اردو نظم کی وسعت کا انکشاف مرثیوں سے ہی ہوتا ہے۔مواد اور زبان کا صحیح اور سچا اتصال ہمیں اردو مرثیوں میں ہی ملتا ہے ۔مختصر یہ کہ اردو مرثیے نے ہر شعبۂ حیات و ادب کے رخسار پر گل گونۂ تقدس مل دیا ہے۔''

(انیس شخصیت اور فن، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 2007، ص179)

ان کی مرثیہ تنقید کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ تو حد سے زیادہ تقدیس کے اسیر ہیں اور نہ ہی محض ادبی لذت کے خواہاں۔ان کے یہاں مرثیے کی تنقید میں متوازن رویہ پایا جاتا ہے۔ وہ فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ فکری اثرات پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔انہوں نے مرثیے کو محض مذہبی یا جذباتی صنف نہیں بلکہ اردو ادب کی جامع اور ہمہ گیر صنف کے طور پر دیکھا ہے۔انیس و دبیر کے مرثیے ان کے نزدیک محض شاعری نہیں بلکہ زبان و بیان کی اعلیٰ مثالیں اور انسانی شعور کی جاوداں روایات ہیں۔ڈاکٹر فضل امام نے بعض ناقدین کی جانب سے اردو مرثیہ پر اٹھائے جانے والے سوالوں کے جواب بھی دیے ہیں اور اس معاملے میں کی جاتی رہی بد دیانتیوں کی طرف بھی بے دریغ انگلی اٹھائی ہے۔کلیم الدین احمد ہی نہیں ان کے نشانے پر شبلی نعمانی بھی رہے ہیں۔ڈاکٹر فضل امام نے 'موازنہ' کے تعلق سے شبلی کے ادبی رویوں پر تیکھے سوال اٹھائے ہیں لیکن وہ کھلے دل سے یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ انیس و دبیر کی سنجیدہ ادبی تنقید کا سلسلہ بھی کہیں نہ کہیں 'موازنہ' کا ہی مرہون منت ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کو اردو مرثیہ نگاروں کی تاریخ اور دکن میں اردو مرثیہ نگاروں کے آغاز و ارتقا کی تاریخ کا بھی قطعی علم نہیں تھا۔ورنہ وہ نہ عاجز نظر آتے اور بساط قیاس وظن پر خامہ فرسائی بھی نہیں کرتے۔پھر بھی یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ شبلی نے سب

سے پہلے ''موازنہ'' کے ذریعہ انیسؔ و دبیرؔ کے فن کی شاعرانہ خصوصیات کا مطالعہ کرنے کی راہیں کھول دی ہیں اور شاعری کے باب میں فصاحت و بلاغت کی تعریف، لفظوں کا محل استعمال، بندش و چستی، موزونیت اور افادیت سے علمی بحث کی ہے۔''

(موازنہ انیس و دبیر، مرتب فضل امام، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1988ء ص 16,17)

ڈاکٹر فضل امام کے مطالعہ مرثیہ کا دائرہ بہت وسیع ہے اور قیمتی بھی۔ انہوں نے کلاسیکی مرثیہ سے لیکر جدید مرثیہ تک، اردو و مرثیہ کی طویل روایت کا اور سمت و رفتار سنجیدہ مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔ ان کی نظر دکنی مراثی پر بھی تھی اور دہلوی مرثیوں پر بھی۔ اردو مرثیہ کا دور عروج تو ان کا خاص موضوع تھا۔ خدائے سخن میر انیسؔ پر ان کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ 'انیس شخصیت اور فن' تو انیس فہمی اور انیسؔ شناسی کے لئے آج بھی معتبر حوالہ ہے۔ انہوں نے میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری کا انتہائی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ انیسؔ کے ہاں زبان کی شائستگی، ندرت، منظر نگاری اور ڈرامائی قوت پر زور دیا ہے۔ اس مقالہ پر گورکھپور یونیورسٹی نے آپ کو ڈی لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا تھا۔ ان کی یہ کتاب اردو مرثیہ نگاری پر ایک مستند تحقیقی کام ہے جس میں انہوں نے اردو مرثیہ کے تاریخی، ادبی اور فنی پہلوؤں کا جامع جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام کی مرتب کردہ 'انیسؔ شناسی' بھی ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں 'انیسؔ کی شخصیت' پر ان کا ایک اہم مقالہ بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر فضل امام مرزا دبیرؔ کی شعری کائنات کا بھی خاطر خواہ جائزہ لیتے ہوئے ان ادبی قدر و قیمت کے تعین میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ 'دبیریت کیا ہے' ان کا ایک اہم مضمون ہے جس میں وہ دبیرؔ کے فکر و فن اور شعری نظریات پر کھل کر باتیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنے بعض مقالوں سے مرثیہ تحقیق و تنقید میں نئی راہیں بھی استوار کیں، جو بعد کے قلمکاروں کو روشنی بخش رہی ہیں۔ 'اردو مرثیوں میں نعت' اور اور سوز خوانی: روایت اور آداب' آپ کے ایسے مقالوں میں سرفہرست ہیں۔ 'دکنی مراثی کی تدریس کے مسائل' بھی ڈاکٹر فضل امام کے نمائندہ مقالوں میں شامل ہے جس میں آپ نے اپنے تدریسی تجربات کی بنیاد پر بعض اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔

کلاسیکی مراثی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فضل امام جدید مرثیوں کی سمت و رفتار پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنی کتاب 'جوش ملیح آبادی: شاعرِ آخر الزماں' میں ڈاکٹر فضل امام نے جوشؔ کے شعری فکر و فن اور ادبی رجحانات سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے مرثیوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے اس بات کو نمایاں کیا کہ جوشؔ ملیح آبادی نے مرثیے کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں جدید فکر اور انقلابی لہجہ پیدا کیا۔ ان کے مرثیوں میں واقعہ کربلا محض مذہبی عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ ظلم کے خلاف احتجاج اور آزادی فکر کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر فضل امام کے مطابق جوشؔ کی زبان میں شعلہ بیانی، خطابت اور آہنگ غالب ہے۔ ان کے مرثیوں میں عام مرثیہ نگاروں کی طرح تفصیلی منظر نگاری کم اور زورِ بیان زیادہ ہے، جس نے مرثیہ کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ڈاکٹر فضل امامؔ کی تحقیق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جوش ملیح آبادی کے مرثیے روایت اور جدت کے سنگم ہیں۔ ان میں کربلا کا پیغام ایک انقلابی، عالمی اور آفاقی صدائے احتجاج کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ان مرثیوں کو سمجھنے کے لیے محض کلاسیکی پیمانہ کافی نہیں بلکہ جدید سیاسی و سماجی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:

''یوں تو جوشؔ کی شاعری کے سبھی اصناف میں ان کا بیدار سماجی سیاسی اور انقلابی شعور اور قومی احساس ملتا ہے لیکن مراثی میں واقعہ کربلا کے پس منظر میں وہ اس موضوع کو بھرپور بالیدگی عطا کرتے ہیں۔ وہ برطانوی دور حکومت میں بھی ''حسین و انقلاب'' جیسا مرثیہ لکھ حکمراں طبقے کے جبر و تشدد، سفاکیت اور بہمیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور بعد میں بھی ظلم و جور و بربریت، قصر سلطنت و حکومت، تاج و سطوت کے خلاف کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ کے لئے اذہان کو بیدار کرتے ہیں اور ''عظمت انسانی'' کا عرفان کراتے ہیں... انھوں نے اپنے مرثیوں میں روح عصر کو جذب کر لیا ہے۔ مظلومیت کا تحفظ اور

ظلم سے جنگ جوش کی مرثیہ نگاری کا اہم موضوع ہے جسے وہ تاریخی اور مذہبی تشبیہات واستعارات و منطقی استدلال سے نظم کرتے ہیں۔آج کے دور میں ہوش ربا گرانی، بدامنی اور بے سکونی کی کیفیت بھی ان کے مرثیوں میں ملتی ہے۔سرمایہ داری، جنگ زرگری، امارت پرستی اور مادی شخصیتوں کے بت جوشؔ کے مراثی میں توڑے جاتے ہیں۔''

(جوش ملیح آبادی: شاعرِ آخرالزماں، مارڈن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1982، ص 150, 151)

مجموعی طور پر دیکھیں تو اردو تحقیق اور تنقید کی عصری روایت میں ڈاکٹر فضل امام ایک معتبر اور روشن نام ہیں۔وہ نہ صرف نقاد اور محقق تھے بلکہ ایک ہمہ جہت عالم بھی تھے جنہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی، فارسی، پنجابی، بھوجپوری اور راجستھانی ادب میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ان کی علمی وادبی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں اور ان کا شمار ان معدودے چند اساتذہ و محققین میں کیا جاتا ہے جنہوں نے اردو ادب کی نئی نسل کو فکری رہنمائی فراہم کی۔ان کی تصانیف آج بھی محققین کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ان کا قلم قاری کو صرف ادب کی لذت نہیں دیتا بلکہ فکری بصیرت اور تنقیدی معیار بھی عطا کرتا ہے۔

اپنی تحریروں کی معرفت ڈاکٹر فضل امام نے اردو تحقیق اور تنقید کو نئی جہت عطا کی اور علاقائی زبانوں کے ادب کو بھی علمی سطح پر متعارف کرایا۔وہ ایک ایسے چراغ تھے جنہوں نے کئی نسلوں کو روشنی بخشی اور اپنی علمی میراث کو آنے والے زمانوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ان کی ادبی تحریروں میں قاری کو ایک ایسی روشنی ملتی ہے جو تحقیق کی باریک بینی اور تنقید کی گہرائی سے جنم لیتی ہے۔ڈاکٹر فضل امام بلا شبہ ہمارے اُن اساتذہ، ناقدین اور محققین میں ہوتا ہے جنہوں نے نئی نسل کو مطالعہ، تحقیق اور تنقید کی طرف متوجہ کیا۔ڈاکٹر فضل امام ایک ایسے چراغ تھے جنہوں نے اردو ادب کے افق کو روشن کیا اور اپنے علمی سرمایے کے ذریعے ایک دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ان کی شخصیت اور علمی خدمات اردو ادب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، جسے آنے والی نسلیں بھی قدر واحترام سے یاد کرتی رہیں گی۔

☆☆☆

اِضطراب

عجیب رات ہے دل ڈوبتا ہی جاتا ہے

شکست خوردہ سپاہی ہو جیسے زنداں میں
اسی طرح میں گھرا رات کے بیاباں میں

تمام شعلہ احساس سے نہ جانے کیوں
اک ایک زخم میرے آج پھر فروزاں ہیں
نہ جانے نیند گئی روٹھ کر کہاں مجھ سے

کدھر نگاہ کروں اور کس طرف دیکھوں

ہر ایک سمت ہی جلتا ہوا سا منظر ہے
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں خنک خنک سی فضا

مِرے شعور کے شعلوں کو اور بھڑکائیں
یہ میرا جسم ہے یا لاش کوئی مرگھٹ پر

نگاہ کے آگ جسے سب ہی چھوڑ آئے ہیں
سلگ رہا ہے سرِ شام ہی سے بستر پر

☆☆☆

شعیب ندیم گورکھپوری
(8565876007)

اردو میں سہرا نگاری

ڈاکٹر امتیاز ندیم
(مئوناتھ بھنجن، یوپی۔موبائل:8090645363)

لغوی اعتبار سے سہرا موتیوں کے ہار کو کہتے ہیں۔ساتھ ہی وہ تہنیتی نظم بھی سہرا کہلاتی ہے جو شادی کے موقع پر نکاح کے بعد پڑھی جاتی ہے۔یہ ایک فرمائشی نظم ہوتی ہے جس میں دولہا دلہن کو مبارکباد اور دعائیں دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی زندگی کے لئے نیک خواہشات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔دولہا-دلہن کے والدین، بھائی، بہن، رشتہ دار اور متعلقین کی مسرت وشادمانی کی ترجمانی بھی اس نظم میں ہوتی ہے۔سہرا نگاری اردو ادب کی شعری روایت کا حصہ ہے اور اردو شاعری کی ایک خوبصورت صنف ہے۔پروفیسر مجید بیدار کے قول کے مطابق-

> "فنی اعتبار سے سہرا ایک مدحیہ نظم ہے جو صاحب شخصیت کی تعریف وتوصیف کے لئے ایسے موقع کا انتخاب کرتی ہے جب شخصیت خود خوشحالی سے ہم کنار ہونے والی ہوتی ہے۔عام زبان میں کسی مرد یا عورت کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے موقع پر لکھی جانے والی شاعری جو دلی جذبات واحساسات کی نمائندگی کا حق ادا کرے ،اسے سہرا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

(مضمون: شاعری میں سہرا اور اس کی عصری معنویت...ادبی جریدہ تمثیل نو، دربھنگہ-شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷م مدیر: ڈاکٹر امام اعظم)

سہرا نگاری کی روایت قدیم ہے۔اسے قصیدے کی ایک شاخ کہا جاسکتا ہے اردو، فارسی اور عربی میں قصیدے کی مستحکم روایت ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ قصیدے کچھ اہم شخصیات کے لئے مخصوص ہیں، لیکن سہرا لکھوانے کا حق ہر اس شخص کو حاصل ہے جو شادی کر رہا ہو۔اور سہرا لکھوانے کی خواہش رکھتا ہو۔قصیدہ اور سہرے میں ایک اور نمایاں فرق ہے۔قصیدہ میں بھاری بھرکم الفاظ اور مشکل استعارات وکنایات کا بھرپور استعمال ہوتا ہے، شاعر اپنی علم دانی کا رعب انھیں الفاظ سے قائم کرتا ہے۔جبکہ سہرے میں ہلکے پھلکے، سبک، عام فہم الفاظ استعمال ہوتے ہیں ۔چونکہ سہرا عوام الناس کے درمیان پڑھا جاتا ہے، لہٰذا ان کے معیارِ تفہیم کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔جبکہ قصیدہ بادشاہ وقت کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا اور درباریوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ نیز مختلف علوم وفنون کے ماہرین ہوتے تھے۔جن کی ناقدانہ نظر کافی تیز ہوتی تھی۔ساتھ ہی ہم عصر شعراء سے بھی تقابل ہوتا تھا۔اس لئے شاعر اپنی علم دانی کا سکہ جمانے کے لئے ہر طرح کے "اسلحہ جات" کا استعمال کرتا تھا۔

ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں اور شہروں میں سہرا لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔پروفیسر ایم اے ضیا سہرے کے حوالے سے رقم طراز ہیں-

> "شادی، خوشی اور کامیابی کی اطلاع پا کر ہدیۂ تبریک وتہنیت نذر کرنا ایک فطری جذبہ ہے۔اور شاید روز آفرینش سے ہی یہ رسم بھی زندگی کے آداب میں شامل ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر منظوم سہرا پیش کرنے کا سلسلہ بھی دیرینہ ہے"۔

(تہنیتی نظموں کا مجموعہ "آرزو کے گلاب" ص ۳)

سہرا اگرچہ فرمائش پر لکھی جانے والی نظم ہے اور شادی جیسے خاص موقع پر ہی کہی جاتی ہے جسے وقتی توجہ حاصل ہوتی ہے۔لیکن فنی اور تخلیقی اعتبار سے اس کی ادبی معنویت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اس میں افکار وخیالات کا تنوع اور منتخب الفاظ کا برمحل استعمال، شعری عظمت کو بلندی عطا کرتا ہے۔ڈاکٹر سرور کریم سہرے کی روایت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں-

" شادی کی تقریبات کے موقع پر تہنیتی نظموں اور سہروں کی روایت اردو تہذیب کا حصہ رہی ہے۔ اردو کے بیشتر مراکز میں سہرے کا چلن رہا ہے۔ سہرے یا تقریبات کے موقع پر کہی گئی نظمیں بیشتر لمحاتی یا وقتی نوعیت کی حامل ہوتی ہیں۔ لیکن شعراء اپنے تخلیقی اظہار سے بعض اوقات انہیں آفاقی حیثیت عطا کر دیتے ہیں۔ در اصل فنکاروں کا ایسا ہی تخلیقی رویہ ایسی نظموں کو ادبی معنویت کا حامل بنا دیتا ہے۔"

(در بھنگہ کا ادبی منظر نامہ-ص ۲۵۶-۲۵۷)

اردو میں سہرا نگاری کے تعلق سے اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ غالبؔ اور ذوقؔ سے قبل اردو سہرا نگاری میں کوئی قابل ذکر نام نہیں ملتا۔ اگر چہ عہد غالبؔ سے قبل دکن میں سہرے کی روایت بیان کی جاتی ہے؟ لیکن ایسی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی جسے سہرے کے نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

اردو سہرا نویسی کو فروغ مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دور میں حاصل ہوا۔ اس ضمن میں پہلا باقاعدہ سہرا مرزا غالبؔ کا تخلیق کردہ ملتا ہے جو انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے صاحب زادے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر لکھا تھا۔ اس سہرے کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند کے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

رخِ روشن کی دمک، گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

ہم سخن فہم ہیں ، غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں ، اس سہرے سے ، کہہ دے کوئی بہتر سہرا

اس سہرے کے تعلق سے مولانا محمد حسین آزاد آب حیات کے صفحہ نمبر ۵۰۳ پر رقم طراز ہیں۔

"مقطع سن کر حضور (بہادر شاہ ظفر) کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں ہے۔ ہم نے جو شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کو استاد اور ملک الشعراء بنایا ہے، یہ سخن فہمی سے بعید ہے ۔ بلکہ طرفداری ہے۔ چنانچہ اسی دن استاد جو حسب معمول حضور میں گئے ۔ تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ استاد اسے دیکھئے ۔ انھوں نے پڑھا اور بہ موجب عادت عرض کی ۔ پیر و مرشد ! درست است ۔ بادشاہ نے کہا، استاد ! آپ بھی ایک سہرا کہہ دیں ۔ عرض کی ، بہت خوب ۔ پھر فرمایا۔ ابھی لکھئے ۔ اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھئے ۔ استاد وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا"۔

اے جواں بخت ! مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

تابش حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پر نور پہ ہے تیرے ، منور سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

پھرتی، خوشبو سے ہے اترائی ہوئی باد بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا، یہ سنادے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مرزا کو ذوقؔ کے سہرے کی خبر مل گئی، مرزا سخن فہم اور ادا شناس تھے۔ سمجھ گئے کہ تھا کچھ اور، اور ہو گیا کچھ اور- معذرت میں ایک قطعہ لکھ کر حضور بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں پیش کیا-

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرِ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں ، جنوں نہیں ، وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی یہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

غالبؔ اور ذوقؔ کے لکھے ہوئے یہ دونوں سہرے "نگارستان سخن" میں شامل ہیں۔ "نگارستان سخن" نورالحسن بن صدیق حسن خان کا ترتیب دیا ہوا ایک مجموعہ ہے جس میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ کے کلام شامل ہیں ۔ غالبؔ اور ذوقؔ کے لکھے ہوئے سہرے کی ہی زمین میں اکبرالہ آبادی نے بھی سہرا لکھا ہے۔ گویا ایک زمین، تین سہرے، تین شاعر ۔ ان تینوں سہروں کے ردیف اور قافیے بھی یکساں ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سہرا اظہار مسرت کے ساتھ ساتھ تہذیبی روایات اور فنی اوصاف کے اظہار کا بھی ذریعہ ہے سہرا احساس دروں کو رونق بخشتا ہے، جذبات میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ نئی فکر اور نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قوت اور توانائی عطا کرتا ہے۔ شادی اور سہرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جہاں سہرا ہوتا ہے وہاں شادی بھی ہوتی ہے۔ سہرے کے ذکر کے ساتھ شادی کا تصور اپنے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ بغیر سہرے کے شادی تو ہوسکتی ہے لیکن بغیر شادی کے سہرا نہیں ہوسکتا۔ سہرا شادی کی خوشگوار لذتوں کو تیز تر کرتا ہے۔ جولانی طبع کو مہمیز کرتا ہے۔ اور نئے مستقبل کے خوبصورت احساسات کو فروغ دیتا ہے۔ بقول ارشد مینا نگری- مالیگاؤں-

"شادی ہر کسی کی زندگی کا بڑا ہی خوبصورت موڑ ہے۔ اس کے بغیر فکر و عمل میں لطیف تبدیلی آجاتی ہے۔ ذمہ داری کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے جو تقدس اور احترام سے معمور ہوتا ہے۔ جس سے طریقِ زندگی میں پاکیزہ نکھار آنے لگتا ہے۔ تقاضائے حیات کے مراحل بڑی دلچسپی سے طے ہو جاتے ہیں۔ گویا شادی ایک بے مثل رعنائی ہے۔ ان تمام مقاصد و لطائف کی لفظی شناخت "سہرا" ہے۔ سہرے کی نظارگی نظر ہی نہیں بلکہ دل اور روح کی شادمانی کا سبب کہلاتی ہے۔ بصارت کی معنویت ذہن و شعور پر اجاگر ہونے لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے، سہرا ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ سہرا ایک خوبصورت نظارہ ہی نہیں، اس سے تمنائیں دلوں میں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ سہرا زندگی کا دلکش محرک ہے۔ اس کی فکر بھی دلکش ہے اور اس کا ذکر بھی دلچسپ ہے۔"

(سہروں کے چہرے-ص۹)

فنی اعتبار سے سہرا نگاری دیگر صنف شاعری سے کسی طرح کم

نہیں ہے ۔ اس میں ادب کی چاشنی، جذبات کی فراوانی، بندش کی چستی، تخیل کی بلند پروازی اور دلچسپ و دلنشیں قافیہ بندی پوری طرح موجود ہے۔ غالبؔ، ذوقؔ، ظفرؔ کے علاوہ دیگر اساتذہ شعراء کے یہاں سہرا نگاری کی مثالیں موجود ہیں ۔ شیخ امام بخش ناسخؔ ، بے خود دہلوی، ارشد کاکوروی، نواب دہلوی، ریاض خیرآبادی، آل احمد سرور، عبدالعلیم آسی، فیض احمد فیض، اختر الایمان، فضا ابن فیضی وغیرہم نے سہرا نگاری میں اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے ۔ عام زندگی کے علاوہ فلموں میں بھی سہرے پیش کئے گئے ہیں ۔ فلمیں سماج کا آئینہ ہوتی ہیں ۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ ۔ وقت کی نیرنگیاں ، جرم وسزا، غم ومسرت کے لمحات، سب کچھ فلموں کا حصہ بنتے ہیں پھر شادی اور سہرے کا اظہار بھلا کیوں کر ممکن نہیں ۔ "دھرکن" ، پالکی، مغل اعظم، چودھویں کا چاند جیسی فلمیں اس کی مثال ہیں۔

سہرے کی ان تمام شاعرانہ خصوصیات کے باوجود اس کی حیثیت ناخلف اولاد جیسی ہے ۔ کسی شاعر کے مجموعہ کلام یا دیوان میں اس کی تمام تخلیقات شامل ہوتی ہیں، متفرق اشعار وقطعات کے لئے بھی گنجائش ہوتی ہے لیکن سہرے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی ۔ قدیم وجدید تمام شعراء نے اس صنف کو محض وقتی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنایا۔ مرزا غالب نے بھی جو سہرا بہادر شاہ ظفر کے لخت جگر شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر لکھا تھا وہ ابتداءً ان کے دیوان میں شامل نہیں ہوا۔ تاریخی حوالوں کے مطابق شہزادہ جواں بخت کی شادی یکم اپریل ۱۸۵۲م کو ہوئی تھی ۔ ظاہر ہے کہ سہرا اس سے چند دن پہلے لکھا گیا ہوگا ۔ غالب کے دیوان کی تیسری اشاعت جولائی ۱۸۶۱ء میں ہوئی تھی ۔ لیکن یہ سہرا اس میں شامل نہیں ہے ایک اندازے کے مطابق دیوان غالب کی پانچویں اشاعت کے بعد اس سہرے کی شمولیت عمل میں آئی ہوگی ۔

غالبؔ کے بعد کے شعراء نے بھی سہرے کو اپنے مجموعے میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اسے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے بھی اس صنف کو قابل توجہ نہیں سمجھا۔ جبکہ دور متوسط سے دور حاضر تک سہرا نگاری کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور ساتھ ہی فکر، فن اور ہیئت کے اعتبار سے اس میں نئے نئے تجربات بھی ہوتے رہے ہیں ۔ اگرچہ دور حاضر میں کچھ کم علم شعراء نے اپنی حریصانہ طبیعت اور فنی کم مائگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سہرے کے ادبی حسن کو مخدوش ومجروح کیا ہے پھر بھی اس کی اہمیت ولطافت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس سلسلے میں پروفیسر شاکر خلیق کے تاثرات قابل ذکر ہیں جو انھوں نے اپنے مضمون "سہرے کی عظمت وادبی معنویت" میں پیش کیا ہے۔

> "سہرا نویسی کا یہ سلسلہ دور متوسط سے ہوتا ہوا دور حاضر تک نظر آتا ہے، شعراء کرام اس فن میں نت نئے تجربات کرتے ہوئے اس کے اندر دلکشی ، توانائی ، شگفتگی اور رعنائی بکھیر رہے ہیں ۔ عام طور پر تہنیتی نظموں میں بندش کی چستی، بلندی خیال، موزوں الفاظ، خیال کی ندرت، شوخی، شگفتگی ، برجستگی اور لطافت کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ کبھی کبھی اظہار خیال اور افراد خانہ کے ناموں کی شمولیت کی وجہ سے جھول پیدا ہو جاتا ہے ۔ جسے فنی عیب تصور کیا جاتا ہے"۔

اس طرح دیکھا جائے تو سہرا ہر دور میں خوشگوار زندگی کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور سماجی روایات کی نمائندگی کرتا رہا ہے ۔ اردو شاعری میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ مواد، ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ۔ لیکن مقصد تخلیق ہمیشہ ایک رہا ہے ۔ سہرا اردو شاعری کی دیگر اصناف کی طرح ایک خوبصورت صنف ہے ۔ اس کے اشعار بھی اپنا ایک اثر رکھتے ہیں، اس کے علاوہ شادی جیسی خوبصورت اور مقدس تقریب کی تہذیبی روایت کے گواہ ہیں ۔ اس کی ادبی حیثیت اور معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اسے بھی دیگر اصناف کی طرح کلیات ودواوین میں جگہ پانے کا حق ہے۔

☆☆☆

ابوالکلام آزاد کی فکر اور موجودہ عہد کے تقاضے

ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی
(صدر شعبہ اردو، جگ جیون کالج، آرہ۔ موبائل: (8770786313)

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہمارے ملک اور تاریخ کا، مذہبی، سیاسی، سماجی، علمی اعتبار سے زندہ و جاوید واقعہ ہے۔ مبصر، محقق، مدبر، دانشور، سیاست داں، صحافی شاعر، صاحبِ طرز انشا پرداز، قرآن و احادیث کے مفسر وغیرہ جیسی مختلف الجہات خوبیوں کی وجہ سے مولانا آزاد کا شمار نابغۂ روزگار ہستیوں میں کیا جانا عام سی بات ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور کارناموں کی ہمہ جہتی نے ان کی ذات کو ہر شعبۂ علم و فکر میں اپنے دانشورانہ افکار و خیالات، مخصوص نقطۂ نظر اور مثبت طریقِ کار کی بدولت جاذبیت اور اثر انگیزی کا حوالہ بنا دیا تھا۔

معاصر عہد میں اگر مسلم جماعت، مسلمانوں کے حال و مستقبل، ان کی سیاسی کارکردگی، سیاست میں عملی حصہ داری، تعلیمی اور سائنسی اعتبار سے مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کو موضوع بنایا جائے تو ابوالکلام آزاد اور ان کے پیش رو دانشوروں کی جماعت کے سربراہوں میں سرسید احمد خاں کو حوالہ بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ اس طریقۂ اظہار کے برخلاف اگر مخصوص کمیونٹی، مذہب اور اس کے ماننے والوں کی فکر کو منہا کر کے آزادانہ، سیکولر اور لبرل انداز میں گفتگو کے سلسلے کو دراز کیا جائے تو مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات اور کارنامے ہر شعبۂ علم میں ہماری رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ سرسید کے علمی کمالات، ان کی دور اندیشی، تعلیمی انقلاب، مختلف علوم سے کسبِ فیض کا جنون وغیرہ جہاں آزاد کو سرسید کا گرویدہ بناتا ہے وہیں وہ سرسید کی اس حکمتِ عملی سے انحراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزی حکومت کی حمایت بھی کرنا ضروری ہے۔ نئے ذہن اور مغربی فکر کے پیروکار مسلمانوں نے جہاں سرسید کی اس فکر کی پیروی کی وہیں دوسری جانب آزادی کے جذبے اور عملی اقدام سے فاصلہ بھی قائم ہوتا چلا گیا۔ مسلم معاشرے کے اس رویے کے زیر اثر دوسرے مذاہب کے لوگوں کے درمیان آزادی کے لڑائی کے تئیں مسلم معاشرے کی سرد مہری کا جذبہ ایک منفی تاثر قائم کر رہا تھا جو اجتماعی اخوت کے لیے بھی خطرہ تھا۔ اسی لیے مولانا آزاد، سرسید کے اس موقف کی مخالفت کرتے ہوئے اسلامی نقطۂ نظر سے وطن کی محبت اور وطن پرستی کا پیغام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عبدالسلام قدوائی 'الہلال' کے حوالے سے مولانا آزاد کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اسلام اور نیشنلزم کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ان کے لیے ملک کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبودگی فکر اسلام کا حکم ہے''۔[۱]

ادبی اعتبار سے مولانا آزاد کی شہرۂ آفاق تصنیف ''غبار خاطر'' اور بعض علمی معاملات میں ان کی کتاب جو خودنوشت سوانح کا ایک حصہ ہے یعنی ''تذکرہ'' کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مذہب کے حوالے سے تفسیر قرآن اور مذہب کی دیگر موضوعاتی کتابوں کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں آزاد نے جس طرح کا انداز اختیار کیا تھا اس نے ان کی شخصیت کو قبول عام کی سند بھی عطا کی۔ ان کے علمی اور دانشورانہ افکار و خیالات نے نہ صرف یہ کہ دانشوری کی پوری روایت کو متاثر کیا۔ بلکہ اس کے دائمی نقوش بھی صفحۂ عصر پر ثبت کر دیے۔

اپنے مشہور زمانہ اور معتوب روزگار رسالوں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے توسط سے مولانا آزاد نے صحافتی زندگی کے معیار کو حق گوئی کا نمونہ بنا کر اپنے دانشورانہ خیالات اور علمی وقار نیز مدبرانہ نتائج کے حوالے سے پیش کیا۔ حکومت وقت کے ناجائز عملی اقدام کو ہدفِ تنقید بنا کر زبان و بیان کے طمطراق اور جلال آمیز اندازِ نگارش نے طنز و تنقید اور ادبی چاشنی کے ذریعہ لوگوں اور عام قارئین کے ساتھ تعلیم یافتہ افراد، سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے احباب کو بھی انقلاب انگیز جذبات سے مملو کیا۔

دوقومی نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے انہوں نے سیکولر اندازِ فکر کو پیش کیا۔ 1947 کے بعد ملک کی آزادی اور تقسیم کے مسئلے پر کانگریس پارٹی کے اہم ترین رکن ہونے کے باوجود کانگریس پارٹی کی منشا کے برخلاف انہوں نے تقسیم کی مخالفت کی۔ اپنی دانشوری اور دور اندیشی کی بدولت آزاد ہندوستان میں تقسیم کے سبب پیدا ہونے والے مسائل سے آگاہ کیا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کا انتقال ہندوستان میں باقی مسلمانوں کی کمزوری کا باعث ہوگا۔ رفتہ رفتہ کثیر آبادی کے زیرِ نگیں ہونے کا المیہ سیاست، تعلیم اور ملکی معاملات میں مثبت طور پر عملی حصے داری کا فقدان ایسے وسوسے تھے جن کا احساس مولانا آزاد کو تھا۔ ان کی دور اندیشی اور عاقبت اندیشی کی صورت گری کے نمونے آج ہندوستان میں تقسیم کی بنیاد پر کی جانے والی سیاست کی شکل میں ہم ملاحظہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا اگر سیاسی تناظر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ان کے خیالات اور فکر کو نمونہ بنایا جائے تو ہم اہم سیاسی معاملات میں صحیح اور غلط امور سے واقفیت کی بنیاد پر کوئی مبسوط لائحہ عمل تیار کر سکتے ہیں۔ سیکولر ملک ہندوستان کی سیاست میں خاص طور سے مسلمانوں کے لئے مولانا آزاد کی سیاسی زندگی ان کی شخصیت اور دانشورانہ افکار و خیالات سے کسبِ فیض کرتے ہوئے آئندہ ملکی سیاست میں ایک مناسب ترین فضا اقلیتی طبقے کے لئے قائم کی جا سکتی ہے۔ جہاں بنیادی حقوق کی حق تلفی پر قدغن لگا کر منصفانہ ماحول فراہم کیا جا سکتا ہے۔

سر سید احمد خان نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام اور رہائشی یونیورسٹی کا جو خواب دیکھا تھا اسے شرمندۂ تعبیر کرنے میں مولانا آزاد کی کوششوں کو تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ سر سید کے انتقال کے بعد 1899 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو ترقی دے کر مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی سعی کا آغاز ہوا تھا۔ برطانوی حکومت کی جانب سے طے شدہ رقم کو جمع کرنے کا حکم دیا گیا مگر اس حکومت کی بد دیانتی اور الحاقی یونیورسٹی کے قیام پر آمادہ ہونے کے خلاف آوازیں بلند کی گئیں۔ ''الہلال'' کے اداریے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے انگریزی حکومت کی اس پیش کش کی سخت تنقید اور مذمت کی۔ وہ ایسی آزاد یونیورسٹی کے خواہش مند تھے جس میں پورے ہندوستان کے مسلمان تعلیمی اداروں کا الحاق ہو۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اگر واقعی مسلمان ایک آزاد اور صحیح معنوں میں اسلامی یونیورسٹی بنا سکیں تو یہ ان کے تمام امراض کا نسخۂ وعید ہے۔''

مذہبی تعلیم اور قرآن و احادیث کے عملی اور اجتہادی نمونے پیش کر کے مولانا آزاد نے مذہبی معاملات میں فکر و خیال کے نئے گوشے روشن کیے اور نئے مباحث کا آغاز بھی کیا۔ ان کی بنیادی تعلیم فقہ، حدیث، قرآن، تاریخ، فلسفہ، منطق، اور زمانے کے مطابق عربی، فارسی کے تمام ہی علوم کو محیط ہے۔ بعد ازاں اپنی خدا داد صلاحیت اور علمی نتائج کی بدولت انہوں نے خاص طور سے مسلمانوں کی زندگی اور حالات، مذہبی معاملات کے ساتھ ہی حکومتِ وقت اور سیاسی نشیب و فراز کو سمجھتے ہوئے جو صحافتی خدمات انجام دی ہیں وہ صحافت سے متعلق افراد اور ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ تعلیمی اقدار کی روز افزوں ترقی کے خواہاں تھے۔ تعلیمِ نسواں اور تعلیمِ بالغاں کے منصوبے اور ان سے متعلق تحریر و تقریر کا ایک طویل سلسلہ بھی مولانا کی فکر اور تعلیم و تہذیب کے سلسلے میں ان کے احساسات و جذبات کا نمائندہ حوالہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ جدید تعلیم اور سائنسی علوم کے بھی اسی طرح مداح تھے جس طرح انہوں نے مذہبی تعلیم اور معاصر عہد کے تقاضوں کے پیشِ نظر تشریح و تعبیر کا آغاز کیا تھا۔ تعلیم کے متعلق ان کی یہ باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

افراد کی حقیقت طرزِ تعلیم سے آشکار ہوتی ہے۔ حقیقت حریت اور انسانیت کی بنیاد پر جس نظامِ تعلیم کی داغ بیل پڑتی ہے اس سے افراد کی روش فکر اور انداز کیا بدل جاتا ہے اور وہ شاہراہ ترقی پر گامزن

ہوجاتے ہیں۔اس کے برعکس وہ نظام تعلیم جو کسی ضابطے یا غور وفکر کے بغیر وجود میں آیا ہے ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیتا ہے جو برسوں سے قومی آزادی کے علمبرداروں کے سینوں میں کروٹیں لیتی رہی ہیں۔

مولانا آزاد کی فکر کے یہ دھارے ماضیِ قریب میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کے اندازِ فکر سے مماثل یا اس کی توسیعی شکل قرار دئے جاسکتے ہیں۔مولانا آزاد کو تقسیمِ ملک کے بعد تعلیمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے کی غرض وغایت کے مدنظر وزیر تعلیم بنایا گیا۔ان کی علمی اور دانشورانہ شخصیت کے شایانِ شان حکومتِ ہند کا یہ فیصلہ آنے والی نسلوں کی زندگی اور ان کے وقار، تہذیب وثقافت، وطن دوستی، اور قومیت کے بہتر تصور اور قومی یک جہتی کے لائحۂ عمل کے پیشِ نظر تھا۔جس کا حق مولانا آزاد نے فکر وخیال کے ہر دائرے سے آگے جاکر ادا کیا۔

مولانا آزاد کے نزدیک تمدنی اور تہذیبی زندگی کے اظہار اور جمہوری اقدار کی بقا اور قومیت کے تصور کو فروغ دینے کے لئے تعلیم ہی واحد وسیلہ تھا۔اس لئے وہ تعلیم کو ذریعہ خیال کرتے تھے مقصد نہیں۔موجودہ عہد میں جس طرح تعلیم کے نظام کو کاروبار اور بازار میں تبدیل کرنے کا رویہ اور سبقت لے جانے کی لہر چل پڑی ہے اور تعلیم کا بنیادی اور اصل مقصد فوت ہوتا جارہا ہے، ایسے میں مولانا آزاد کے نظریۂ تعلیم کی اہمیت وافادیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

اس مضمون میں محض مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی اور قومی تصور کے ساتھ ہی تعلیم سے متعلق نظریۂ فکر کو اختصار کے ساتھ زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے۔جس سے اندازہ ہوسکے کہ مولانا کے تعلیمی اور سیاسی افکار کی عصری معنویت کیا ہے؟ ساتھ ہی ان کے اس طرح کے مثبت اندازِ فکر کو معاصر عہد کی بدامنی اور بے اعتدالیوں کے درمیان ازسرِ نو دریافت کرنے کی ضرورتیں مزید بڑھ جاتی ہیں۔جو وقت کی اہم ضرورت بھی ہے اور تقاضا بھی۔

☆☆☆

غزل

بخار سردی بدن درد کھاج تھوڑی ہے
مریض عشق ہوں میرا علاج تھوڑی ہے

شریف لوگ ہیں سارے یہاں جو بیٹھے ہیں
سوا مرے کوئی عاشق مزاج تھوڑی ہے

چمن میں دل کے لگالوں میں عشق کا ہودا
نکما بیٹھا ہوں کچھ کام کاج تھوڑی ہے

خمار عشق تھا تب جب مری جوانی تھی
ابال خون میں کل تھا جو آج تھوڑی ہے

کروں گا عشق کھلے عام میں مری مرضی
ضعیف ہوں تو کیا خوف سماج تھوڑی ہے

جوان بچے ہیں بیوی ہے پھر بھی دیکھو تو
پھنسا ہے جال میں لڑکی کے لاج تھوڑی ہے

وفا خلوص ہی انجم کو چاہئے تجھ سے
مری ڈیمانڈ ترا تخت وتاج تھوڑی ہے

☆☆☆

خورشید انجم پورنوی
(پورنیہ، بہار۔موبائل:7481940747)

فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار

ڈاکٹر بشریٰ بانو
(شعبۂ اردو، مہیلا پی جی کالج، لکھنؤ)

انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اُردو نثر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کالج نے نہ صرف یہ کہ اُردو نثر کی نشونما کے بہترین فرائض انجام دیے بلکہ آئندہ کے لیے بھی ایک ایسی سمت وراہ متعین کی جس کے ذریعے اردو نثر ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہوگئی۔ اس کالج کی ابتداء جس زمانے میں ہوئی وہ ہندوستان کی تاریخ کا پر آشوب دور تھا۔ بظاہر وہ شورشیں سرد پڑ گئی تھیں جس کی ابتداء ۱۸ رویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہوئی تھی مگر بادمخالف کے تند و تیز جھونکوں سے مغل حکومت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تھا۔ صوبائی بغاوتیں شہنشاہی رمز ۱۹ رویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اُردو نثر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کالج نے نہ صرف یہ کہ اُردو نثر کی نشونما کے بہترین فرائض انجام دیے بلکہ آئندہ کے لئے بھی ایک ایسی سمت وراہ متعین کی جس کے ذریعے اردو نثر ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہوگئی۔ اس کالج کی ابتداء جس زمانے میں ہوئی وہ ہندوستان کی تاریخ کا پُر آشوب دور تھا۔ بظاہر وہ شورشیں سرد پڑ گئی تھیں جس کی ابتداء ۱۸ ویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہوئی تھی مگر بادمخالف کے تند و تیز جھونکوں سے مغل حکومت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تھا۔ صوبائی بغاوتیں شہنشاہی رمزیت کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دلّی کو اور کمزور کر دیا تھا۔ غیر ملکی طاقتیں ہندوستان کی تاریخ کے اُس سیاسی انتشار سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل تھیں۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کی کامیابی نے ہندوستان میں ان کی جڑیں مضبوط کر دیں اور وہ کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) جس کا اغراض ومقاصد تجارت کرنا تھا۔ اس کامیابی اور کامرانی کے بعد حکومت کا خواب دیکھنے لگی۔ بکسر کی لڑائی کی کامیابی نے انگریزوں کو اور حوصلہ بخشا۔ ہندوستان میں وہ ایک مستحکم اور مضبوط قوم کی شکل میں پروان چڑھی اور سیاست کے میدان میں اپنے قدم جمانے لگی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ ہندوستانیوں کی زبانیں اپنے ملازمین کو سکھائی جائیں، کیونکہ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کمپنی والے ہندوستان کی روح تک پہونچ جائیں گے اور اُس ملک پر مکمل طور پر قبضہ کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ یہ ان کے سمجھنے کے لئے بڑی آسان ترکیب ثابت ہوگی۔ غرض مقصد جو بھی رہا ہو کلکتہ میں اس کالج کا قیام ۴ رمئی ۱۸۰۰ء میں عمل میں آیا۔ کالج کا افتتاح ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ویلیزیلی کے ہاتھوں ہوا۔ کالج کے قیام سے پہلے بھی اردو میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ تاہم اب اس کو ایک مہم کے طور پر اپنایا گیا اور کالج کی ایک شاخ اردو اور ہندی کے ترجمے اور ان کی تعلیم کے لئے وقف کر دی گئی۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام چونکہ سرکاری طور پر پہلی اور منظم کاوش تھی اس لئے اس اس کا اردو نثر کی ترقی اور رفتار پر خوش گوار اثر پڑا۔ غرض تاریخی اعتبار سے فورٹ ولیم کالج ایک ایسا اہم ادارہ ہے جس کے بغیر اردو نثر کی داستان نامکمل رہے گی۔

حسن اتفاق سے ہندوستانی شعبے کا جو سربراہ مقرر کیا گیا اسے پہلے ہی سے ہندوستانی زبانوں خاص طور پر اردو سے گہری دلچسپی تھی۔ اُن کا نام تھا جان گلکرائسٹ۔ یہ اردو دنیا کی ایک مشہور شخصیت ہے اور ان کا نام لئے بغیر نثر کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ گلکرائسٹ شعبۂ اردو یا شعبۂ ہندوستانی کی سربراہی سے پہلے اردو میں چھوٹا موٹا تصنیف وتالیف کا کام کر چکا تھا۔ ترجمے سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی اور کالج میں آنے سے پہلے وہ اس کی شروعات کے چکے تھے۔ اردو میں ان کی دلچسپی کے سبب انھیں کالج کا پہلا سربراہ مقرر کیا گیا اور اس کی تمام نگہداشت اور ترقی کے تمام مراحل کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ارباب اردو کو مختلف جگہوں سے کالج کے مرکز میں لاکر جمع کیا۔

گلکرائسٹ نے کالج کو وسعت دینے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اردو یا ہندی میں شاعری کے نمونے تو حد سے زیادہ ہیں۔ اب نثر کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اس کے لئے اس کو اچھی زبان جاننے والوں کی ضرورت تھی۔ مگر جیسا کہ تاریخ سے یہ معلوم ہے کہ جو لوگ زبان پر قدرت رکھتے تھے انھیں نثر سے نہیں بلکہ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ اس لیے گلکرائسٹ کو اپنے زمانے کا کوئی مشہور ادیب میسر نہیں ہوا۔ مجبوراً اس نے کچھ ایسے لوگوں کو کالج میں ملازم رکھا جن کی نہ تو کوئی ادبی حیثیت تھی اور نہ ہی جن کے نام سے لوگ واقف تھے۔ میر امن، شیر علی افسوس، بینی نرائن اور مرزا لطف وغیرہ کو شاید ہی کوئی جانتا رہا ہو لیکن گلکرائسٹ نے اُن کی تربیت کی اور اُن کو اُردو کی خدمت کے لیے اس طرح تیار کیا کہ آج اُن میں تقریباً ہر فرد اردو ادب کی دُنیا میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے تحت اردو کی جو کتابیں قبولیت عام کی دولت سے مالا مال ہوئیں ان میں میر امن کی باغ و بہار سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ باغ و بہار اپنی اہلیت کے اعتبار سے ایک داستان ہے۔ اس میں چار درویشوں کا قصہ مذکور ہے۔ داستان کا آغاز بادشاہ آزاد بخت کی لاولدی سے ہوتا ہے۔ باغ و بہار کا دستانوی رنگ دیگر داستانوں سے مختلف ہے کہ بادشاہ آزاد بخت قصے کے آخر میں صاحب اولاد ہو جاتا ہے اور اس میں کسی فقیر یا عامل کی دُعا کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ان چاروں درویشوں کے کرداروں میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ چاروں کے ایک سے حالات تھے۔

میر امن نے باغ و بہار کو ۱۸۰۱ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۰۲ء میں مکمل کیا۔ باغ و بہار کا سب سے بڑا حسن اُس کی زبان ہے۔ یہ زبان میر امن نے اُس عہد میں لکھی جب انشاء پردازی کا طلسم مکمل طور پر نہیں ٹوٹا تھا۔ اور فارسی لکھنا اور عبارت آرائی کا کمال دکھانا علمیت اور قابلیت کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ میر امن نے کھلے الفاظ میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ باغ و بہار اُن کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے لیکن اس اعتراف کے باوجود میر امن کی عظمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس عظمت اس میں استعمال ہونے والی زبان پر منحصر ہے۔ ان کے استعمال سے نثر میں جان پیدا ہو گئی۔ یوں تو اس کی زبان میں نہ رنگینی ہے اور نہ برمحل فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال بلکہ ان میں وہ الفاظ ملیں گے جو عام طور پر سمجھ لئے جاتے ہیں پھر بھی اُس کی شہرت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ غرض انھوں نے باغ و بہار میں جو زبان استعمال کی ہے اس پر آج کی نثر کا ایوان تعمیر ہوا۔

ایک اور وجہ سے باغ و بہار اہمیت کی حامل ہے کہ ایک طرح سے اس نے داستان نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا ہے کہ رجب علی بیگ سرور نے اس کے جواب میں فسانہ عجائب لکھا۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جینباغ و بہار کی تعریف میں لکھتے ہیں:

> ''اس میں قدم قدم پر محاورہ، روزمرہ کی نمکیت ہے۔ میر امن کی کوئی عبارت ایسی نہیں جس میں جملوں کی ساخت اور محاورے کی عمدہ تلاش نہ ہو۔''

داستان میں جو قبول عام باغ و بہار کے حصے میں آیا ہے وہ اردو کی کسی اور داستان کو نصیب نہیں ہوا۔ عوام و خواص دونوں میں یہ داستان تصنیف کے اتنے برس بعد بھی دلچسپی سے سنی اور پڑھی جاتی ہے۔ باغ و بہار کی اس غیر معمولی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کا انداز بیان اردو کی سب داستانوں سے زیادہ دلکش اور دلنشیں ہے۔ اور اس کی اس دلکشی اور دلچسپی کو ہر نقاد نے سراہا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔ اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ اس کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے کتاب کے کسی حصہ میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کی ہر عبارت میں ایسی روانی ہے کہ پڑھنے والا قصہ کی دلچسپی سے قطع نظر اس کی روانی میں کھو سا جاتا ہے۔ میر امن کے اسلوب تحریر کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا فطری اور عوامی لب و لہجہ ہے۔ انھوں نے تکلف اور تصنع سے بہت کم کام لیا ہے۔ باغ و بہار کی ایک اہم خصوصیت اس کی ہند اسلامی فضا ہے۔ میر امن نے اس میں ہماری معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی اتنی کامیاب عکاسی کی ہے کہ اپنے عہد کے ہندوستان کے مسلمانوں کے کھانے پینے، رہن سہن، رسم و رواج، عقائد و میلانات، موت و زندگی کی بھرپور نقشہ کشی اس کتاب کی صفحات میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے باغ و بہار ایک حیرت ناک نثری اور ادبی کارنامہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے کی اپنے اندر بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح کے نثری اسلوب میں علمی مضامین اور تاریخ و تنقید برتنے کی صلاحیت بلاشبہ نہیں ہے۔ پھر بھی سرسیّد اور ان کے رفقاء، شبلی، نذیر احمد اور حالی کو علمی و نثری اسلوب تحریر کی تشکیل میں اس سے مدد ملی ہے۔ خاص کر غالب کی ادبی نثر اور نذیر احمد کا افسانوی اسلوب تحریر اس سے بے حد متاثر معلوم ہوتا ہے۔

☆☆☆

کرشن چندر کا 'شہزادہ' کل اور آج

جمیلہ بی بی
(گورکھپور۔موبائل:9307035964)

کرشن چندر اردو کے ان معروف افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کے افسانوں میں فطرت کی عکاسی کے ساتھ انسانی زندگی کی کڑوی سچائی کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ان کی قلم میں ایک ایسا جادو ہے جو قاری کے دل کی گہرائیوں تک اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ان کی تحریر کو پڑھنے کے بعد انسانی جذبات کا سمندر لہریں مارنے لگتا ہے۔ان کے کردار چلتے پھرتے انسانی وجود کا حصہ نظر آتے ہیں اور ان کے الفاظ قاری کو اپنے خود کے الفاظ معلوم ہونے لگتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار انسانی سماج کے ہر دور کے انسانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مل جائیں گے۔ اس کی واضح مثال ان کا افسانہ شہزادہ ہے۔شہزادہ ان کی مشہور کہانیوں میں سے ایک ہے جو انسانی نفسیات کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔یہ کہانی نہیں بلکہ ہمارے سماج کی ایک تلخ حقیقت ہے۔انسانی سماج چاہے جتنی بھی ترقی کر لے لیکن اس کی نفسیات وہی کی وہی رہتی ہے۔ہاں اس کے اظہار کا طریقہ بدل جاتا ہے۔کرشن چندر انسانی نفسیات کے جادوگر مانے جاتے ہیں۔یہ بات بالکل درست ہے کہ ہر انسان اپنی نفس کے ہاتھوں قید رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ مختلف خواہشات کی جکڑ میں رہتا ہے۔یہ بھی سچ ہے کہ عمر کے لحاظ سے اس کی خواہشات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔جہاں بچپن میں ایک بچے کی خواہش کھلونوں سے وابستہ ہوتی ہے، وہیں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ ایک ہمسفر کا خواب بننے لگتا ہے اور اپنے تصور میں ہی اس کو اپنا سب کچھ مان لیتا ہے۔شہزادہ بھی انہیں نفسی خواہشات میں سے ایک ہے۔شہزادہ ایک ایسا لفظ ہے جس کا خواب ہر لڑکی دیکھتی ہے۔جس کے ساتھ وہ اپنی آگے کی شادی شدہ زندگی گزارنا چاہتی ہے۔

ایک لڑکی ہی نہیں بلکہ اس کے ماں باپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کی لخت جگر کو ایک ایسا ہمسفر ملے جو اس کے دامن کو خوشیوں سے بھر دے۔مگر افسوس ایسا ہوتا نہیں ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں جہیز جیسی لعنت جو موجود ہے، جس کے بغیر ایک لڑکی کی شادی کا تصور ممکن نہیں۔جہیز ایک ایسی لعنت ہے جس کا زہر ہر دور میں ایک بیٹی اور اس والدین کے ہی حصے میں آتا ہے۔اس لعنت نے ہر دور میں لڑکیوں کے ارمانوں کا خون کیا ہے۔اس نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی جوانی کو سسکتے ہوئے چھوڑ دیا ہے، نہ جانے کتنے گھروں کو برباد کیا ہے۔آج انسان ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے چاند تک پہنچ گیا ہے لیکن صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی جہیز جیسی لعنت کے وار سے لڑکیوں کے ارمانوں کا قتل ہو رہا ہے۔کرشن چندر کا یہ افسانہ سماج کی اسی کڑوی سچائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی قتل کی روداد بیان کرتا ہے۔سدھا ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی ہے مصنف کے لفظوں میں:۔

> ''سدھا نہ خوبصورت تھی نہ بدصورت، بس معمولی سی لڑکی تھی۔سانولی رنگت، صاف ستھرے ہاتھ پاؤں، مزاج کی ٹھنڈی مگر گھریلو کھانا پکانے میں ہوشیار، سینے پرونے میں طاق، پڑھنے لکھنے کی شوقین، مگر نہ خوبصورت تھی نہ امیر، نہ چنچل، دل کو لبھانے والی کوئی بات اس میں نہ تھی۔بس وہ تو ایک بے حد شرمیلی سی اور خاموش طبیعت والی لڑکی تھی۔''

جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر کسی کو امیر اور خوبصورت لڑکی چاہیے ہوتی ہے۔ظاہری خوبصورتی کے پیچھے تو سب بھاگتے رہتے ہیں لیکن اندرونی خوبصورتی کوئی نہیں دیکھنا چاہتا۔ایسے میں شادی تو ہو جاتی ہے لیکن ایک گھر نہیں بن پاتا۔لڑکی اپنی خوبصورتی اور پیسوں کے ساتھ ایک مغرور

دماغ بھی لے کر آتی ہے۔ جو نہ دل کو سکون دیتی ہے نہ ہی ایک اچھا گھر بناتی ہے۔ بالآخر وہ گھر نہیں ایک مکان بن کر رہ جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد جب مادی خواہشات سے انسان کو سکون نہیں ملتا ہے تو وہ روحانی سکون کی تلاش کرنے لگتا ہے۔ مگر افسوس پھر بھی لوگوں کے نظریات میں تبدیلی نہیں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی خوبصورت دکھے اور ہمیشہ ہنستی کھیلتی رہے۔ اس کہانی میں سدھا کا باپ جیون رام بھی یہی چاہتا ہے وہ اپنی بیٹی سدھا کو لے کر کبھی کبھی بہت فکر مند ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے:۔

''تو نے کیسی لڑکی جنی ہے؟'' جیون رام کبھی کبھی مگھی کو ستانے لگتا۔ ''ہر وقت چپ رہتی ہے۔ ہر وقت نگاہ نیچی رکھتی ہے۔ ہر وقت کام میں جُٹی رہتی ہے۔ اس کے منہ پر کبھی ہنسی نہیں دیکھی۔ اب کپور صاحب کی لڑکیوں کو دیکھو، ہر وقت پھولوں کی طرح مہکتی رہتی ہیں۔ ہر وقت گھر کو گلزار بنائے رکھتی ہیں، اور ایک سدھا۔۔۔۔'' جیون رام اخبار پٹک کر چپ ہو گیا۔ مگھی بارہ آنے والا بھات اور چنے کی پتلی دال اس کے سامنے رکھتی ہوئی کہتی: ''ان بچیوں کی بات مت کرو۔ ان بچیوں کا باپ سپرنٹنڈنٹ ہے۔ چار سو روپے گھر لاتا ہے۔ میری بچی کے پاس صرف دو قمیض ہیں اور کپور صاحب کی لڑکیاں دن میں دو سوٹ بدلتی ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے۔۔۔۔؟''

اصل میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہر ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی خوش رہے، مسکراتی رہے، دیکھنے میں اچھی لگے چار لوگ دیکھیں تو اس کی تعریف کریں، ان کی بیٹی کبھی مایوس نہ رہے۔ لیکن ایک بیٹی کی نفسیاتی کیفیت تو صرف ایک ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کی بیٹی کو کیا چاہیے۔ اس کو کس چیز کی کمی ہے۔ وہ کیوں خوش نہیں ہے۔ کیوں کہ ایک ماں بھی تو بالکل انھیں کیفیات سے گزر چکی ہوتی ہے۔ یہ معاملہ صرف ایک بیٹی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنی بیوی کے متعلق بھی شوہر کی یہی خواہشات ہوتی ہیں۔ لیکن ایک عورت کے اندر چھپے جذبات کو وہ نہیں سمجھ سکتا۔ ایک عورت کے دل میں کیا چل رہا ہے وہ یہ نہیں جان پاتا۔ ایک عورت اپنے گھر کو سنبھالتے سنبھالتے اپنی خود کی خوشیوں کو بھول جاتی ہے اور اس کا شوہر سوچتا ہے کہ چلو یہ تو اسی میں خوش ہے۔ اسے کس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ پوچھنا ہی بھول جاتا ہے۔ یہی حال ایک لڑکی کا بھی ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے گھر کے حالات دیکھتی ہے تو اپنی خواہشات کو مارنے لگتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی خوشیاں بھی مر جاتی ہیں۔ وہ بجھی بجھی سی رہنے لگتی ہے۔ اس کو جس چیز کی کمی ہے وہ اس کو کھٹکنے لگتی ہے۔ اور جب یہ خواہشات حقیقت میں پوری نہیں ہو پاتی ہیں تو وہ ان کو اپنے خیالوں میں پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کرشن چندر نے اس افسانے میں نسوانی جذبات کی یہ عکاسی بڑے ہی معنی خیز انداز میں کی ہے۔ سدھا اور اس کی ماں کے دل کے حالات ہر وہ عورت اور ایک لڑکی سے الگ نہیں جو ان حالات سے گزر چکی ہیں۔

کرشن چندر نے جہاں ایک عورت کی نفسیات پر قلم آزمائی کی ہے وہیں ایک مرد کے جذبات کی عکاسی بھی کی ہے۔ ایک مرد اپنے آپ کو کبھی بھی کسی کے سامنے کمتر دکھانا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی کمی کو چھپانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور بنا لیتا ہے۔ جب پیسوں کی کمی کی وجہ سے جیون رام نے سدھا کا کالج جانا بند کرا دیا تو اس نے اپنے ساتھی طوطا رام سے اس کی وجہ پیسوں کی کمی نہیں بتائی بلکہ یہ کہہ دیا کی میں افورڈ نہیں کر سکتا۔

طوطا رام کی لڑکی نے تو اپنی پسند سے اپنا بر ڈھونڈ لیا تھا۔ جو اس کے کالج میں ہی پڑھتا تھا اور امیر بھی تھا۔ لیکن سدھا اس معاملے میں بد قسمت ہی رہی۔ اب تو سدھا کو دو سال ہو گئے کالج چھوڑے ہوئے، وہ ایک فرم میں ٹائپسٹ کا کام کرنے لگتی ہے۔ اس کے والدین نے بہت کوشش کی لیکن سدھا کو کسی نے اب تک پسند نہیں کیا۔ ان دو سالوں میں وہ اور بھی خاموش ہو گئی تھی۔ ہاں کچھ تبدیلی ضرور آئی تھی وہ یہ کہ اس کے اندر کا وقار بڑھ گیا تھا۔ کیوں کہ اس نے اب پیسے کمانے شروع کر دیے تھے۔ اس لیے اس کے والدین بھی اب اس کے لیے ایک اچھا بر تلاش کرنے میں اور شدت سے لگ گئے تھے۔ انھوں نے کبھی بھی سدھا کے پیسوں کو خرچ نہیں کیا تھا بلکہ اس سے جہیز میں دینے کے لیے ایک اسکوٹر بھر کا پیسہ جمع کر لیا تھا۔ اسی دوران موتی نام کا ایک خوبصورت لڑکا سدھا کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور اس کو دیکھنے کے بعد سدھا کے دل کا حال مصنف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

''موتی نے گہرے براؤن رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا ۔اس کی سنہری رنگت پر اس کے سیاہ گھنگھریالے بال بے حد خوبصورت معلوم ہوتے تھے،اور جب وہ سجی سجائی سدھا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو اندر ہی اندر اس معصوم لڑکی کا دل پگھل گیا اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں میں بجنے لگی ،اور بڑی مشکل سے وہ چائے کی پیالی موتی کو پیش کر سکی۔

موتی پہلا ایسا لڑکا تھا جو سدھا کو پسند آ گیا تھا۔دوسرے لفظوں میں موتی کو دیکھتے ہی وہ موتی کو اپنا دل دے بیٹھی تھی ۔ پر افسوس موتی نے اس کے دل کی خوبصورتی کو نہیں پہچانا اور اس نے بھی اس رشتے سے انکار کو دیا۔ وجہ سدھا اس کو پسند نہیں آئی تھی ۔لیکن سدھا تو اس کے خیالوں میں ڈوب گئی رات بھر موتی کے ہاتھوں کا لمس اس کی روح گدگداتا رہا۔موتی کے انکار کے بعد سدھا بجھی بجھی سی رہنے لگی، آنکھیں میلی ہو گئی اور اس کے ہونٹ سکڑ گئے ، چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا کرشن چندر کے لفظوں میں اس کی صورت ایسی ٹھنڈی اور ٹھس نکل آئی تھی کہ اسے دیکھ کر کسی برف کا امکان ہونے لگا تھا۔ایک دن دفتر میں اوور ٹائم کرنے کے بعد جب واپسی میں اندھیرا ہونے لگا تو سدھا اسی اندھیرے میں سامنے آصف علی پارک میں چلی گئی اور ایک پیڑ کے نیچے تھوڑا آرام کرنے کی غرض سے بیٹھ گئی ۔ پارک کی تنہائی اور شام کی گہرائی میں اسے موتی کا خیال آ گیا۔خیال ہی نہیں بلکہ اس نے موتی کو اپنے بہت قریب محسوس کیا۔اس نے آنکھیں بند کر لی، دونوں میں باتیں ہونے لگی۔اس وقت بھی موتی کی خوبصورتی سدھا کے دل کو چیر رہی تھی۔اس نے روتے ہوئے موتی سے شکایت کی کہ تم نے میرے رشتے سے انکار کیوں کیا؟۔سدھا کے اس سوال پر موتی کہتا ہے اس میں رونے کی کیا بات ہے ہر انسان کو اپنی پسند اور ناپسند کا حق ہے۔لیکن سدھا اس سے شکایت کرتی جاتی ہے۔

''مگر تم نے کیا دیکھا تھا میرا؟ جو تم نے مجھے ناپسند کر دیا۔کیا تم نے میرے ہات کا پھلکا کھایا تھا ؟ میرا پلاؤ چکھا تھا ؟ کیا تم نے میرے دل کا درد دیکھا تھا ؟ اور وہ بچہ جو تمہیں دیکھتے ہی میری کوکھ میں ہمک کو آ گیا تھا ۔؟تم نے میرے چہرے کا صرف سپاٹ پن دیکھا۔میرے بچے کا حسن کیوں نہیں دیکھا۔؟تم نے وہ بات کیوں نہیں دیکھے جو زندگی بھر تمہارے پاؤں دھوتے ۔اور وہ بٹن جو میں تمہاری قمیص پر کاڑھنے والی تھی ،تم میرے جسم کی رنگت سے ڈر گئے ۔تم نے اس سوئٹیر کا اجلا رنگ نہ دیکھا جو زندگی بھر تمہارے لئے بننا چاہتی تھی ۔موتی تم نے میری ہنسی نہیں سنی ۔میرے آنسو نہیں دیکھے ۔میری انگلیوں کے لمس کو اپنے خوبصورت بالوں میں محسوس نہیں کیا ۔میرے کنوارے جسم کو اپنے ہاتھوں میں لرزتے ہوئے نہیں دیکھا تو پھر تم نے کس طرح مجھے ناپسند کر دیا تھا؟''

یہ تمام باتیں سدھا نے موتی سے اپنے خیالوں میں ہی کہہ دیا۔ موتی کا وجود اس کے ذہن میں گھر کر گیا تھا۔اس نے موتی کے لمس کو بھی محسوس کیا۔وہ اس سے اس طرح گھل مل گئی تھی کی اس سے گلے شکوے بھی ہونے لگے ۔یہ موتی کے خیال ہی کا نتیجہ تھا کہ اب سدھا کے اندر تبدیلی آنے لگی۔وہ موتی کی محبت میں رنگنے اور نکھرنے لگی۔اس تبدیلی کو اس کے والدین نے بھی محسوس کیا۔اب وہ بھی اندر ہی اندر خوش ہونے لگے کہ چلو ان کی لڑکی نے اپنے لیے کوئی لڑکا تلاش کر لیا ہے ۔اب وہ انتظار کرنے لگے کہ کب سدھا اس لڑکے کے بارے میں بتائے اور کب وہ لوگ اس کا ہاتھ پیلا کر دیں ۔ سدھا کی عمر اب پچیس کی ہو گئی تھی ۔لیکن اس نے ابھی تک اپنی خوشی کی وجہ اپنے ماں باپ کو نہیں بتائی ۔مگر وہ بھی ان کو کیا بتاتی کہ اس نے بس اپنے خیالوں میں ہی اپنے شہزادے کو بسا رکھا ہے جو حقیقت میں اس سے بہت دور ہے ،وہ اس کو کسی کے سامنے نہیں لا سکتی ہے ۔والدین انتظار کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور اپنی طرف سے رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں ۔ایک روز ایک حلوائی کا رشتہ آیا جس کی عمر چالس کی تھی ۔ سدھا اس کا ذکر موتی سے یوں کرتی ہے:۔

''وہ لوگ آج میرے لئے ایک بڈھا حلوائی ڈھونڈ کے لائے تھے۔''

''پھر؟'' موتی نے ہنس کر پوچھا۔

''میں نے صاف انکار کر دیا۔''

''تو نے انکار کیوں کر دیا پگلی۔ شادی کر لیتی تو زندگی بھر آرام سے بیٹھی مٹھائی کھاتی۔''

''اور تمہیں چھوڑ دیتی؟'' سدھا نے پیار بھرے غصے سے موتی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں نے بھی تو تم سے شادی نہیں کی؟'' موتی نے اس کی کمر میں ہات ڈالتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوا؟'' سدھا اس کے گال کو اپنے گال سے سہلاتی ہوئی بولی: ''تم میرے پاس تو ہو، شادی سے بھی زیادہ میرے پاس ۔۔۔۔ ہر وقت میری مٹھی میں گویا ۔۔۔'' موتی ہنس کر بولا: ''ہاں یہ تو صحیح ہے، میں بالکل تمہاری مٹھی میں ہوں ، جب چاہو بلا لو۔''

سدھا اپنے خیالوں کی دنیا میں اتنی ڈوب جاتی ہے کہ موتی اس کے وجود کا حصہ بن گیا ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے اسے بلا لیتی ہے، اس سے باتیں کرتی ہے اور ناراض بھی ہوتی ہے۔ کسی نے صحیح ہی کہا ہے کہ خیالوں کی دنیا بڑی ہی خوبصورت ہوتی ہے۔ دل سے دل کو راہ مل جا تی ہے۔ سب کچھ اپنی مرضی کے موافق ہوتا ہے کسی کا اس میں دخل نہیں ہوتا ہے۔ سدھا موتی کے ساتھ سینیما بھی دیکھنے جاتی اس کے لیے اپنے بغل والی سیٹ بک کرتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتے ہیں۔ سدھا اپنے سر کو موتی کے کندھوں پر رکھ دیتی ہے۔ موتی کہتا ہے۔ میرے کندھے پر سر رکھ دینے سے تمہیں کیا نظر آ تا ہے؟ تو سدھا بولتی ہے۔ وہ تصویر نظر آتی ہے جو اس ہال میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی نہیں دیکھ سکتا۔

اس طرح سدھا کی محبت رنگ لاتی ہے اور وہ دن بہ دن اور ہی حسین ہوتی جاتی ہے۔ اس کی شخصیت میں نکھار آتا جاتا ہے۔ اس کو خود سے محبت ہو جاتی ہے۔ اپنے کپڑوں کی سلائی وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتی ہے۔ دوسری لڑکیاں اس پر رشک کرتی ہیں۔ وہ اس سے پوچھتی ہیں۔

''کیسا ہے وہ تیرا؟''

''گورا رنگ ہے۔ بال گھنگھریالے ہیں ہنستا ہے تو موتی جھڑتے ہیں۔'' سدھا جواب دیتی ہے۔ ''کیا تنخواہ لیتا ہے؟''

''بارہ سو'' لڑکیاں چیخ کر پوچھتیں۔ بارہ سو تو ہمارے فرم کے مینیجر کی تنخواہ ہے۔''

''وہ بھی ایک فرم میں مینیجر ہے۔'' سدھا جواب دیتی ہے۔

''اری ہمیں دکھائے گی نہیں؟ بس ایک بار دکھا دے ۔۔۔۔ ہم دیکھ تو لیں کیسا ہے تمہارا وہ !'' ''دکھا بھی دوں گی کہو تو دفتر میں بلا کے دکھا دوں!''

سدھا اپنے خوابوں کی دنیا میں اتنی خوش رہنے لگی تھی کہ اس سے اس کی اصل عمر کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا پینتیس کے بجائے وہ تیس کی لگتی تھی۔ اس کی خوشیاں اس کے رہن سہن سے جھلکتیں۔ اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ اب وہ اپنی مانگ میں سندور اور ماتھے پر بندیا بھی لگانے لگتی ہے۔ اس لیے لوگوں کا شک اور بھی پختہ ہو گیا تھا کہ کوئی تو ہے اس کی زندگی میں جس سے اس کی شادی نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ کسی کو اس کے بارے میں بتانا چاہتی ہے۔ لیکن کسی کو بھی اس بارے میں اس سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی کیونکہ اب سدھا ایک سنجیدہ اور باوقار عورت بن گئی تھی۔

اس طرح سے موتی کے خیالوں میں ہی سدھا نے اپنی زندگی کے چالس سال پورے کر لیے۔ اپنی چالسویں سالگرہ کی شام وہ موتی کو متھرا روڈ کے جاپانی گارڈن میں لے گئی تھی اس خوبصورت باغ میں موتی بھی بالکل ویسا ہی دکھ رہا تھا۔ دونوں میں عشق و محبت کی باتیں ہوئیں۔ اس طرح:

سدھا کی زندگی خوشیوں سے لبریز ہو گئی تھی۔ وہ لوگوں سے بے پرواہ اپنی زندگی اپنے طور پر گزار رہی تھی۔ پھر ایک دن اس کے فرم کا مینیجر بدل گیا۔ اس کی جگہ ایک دوسرا مینیجر رکھا گیا جو سدھا کو بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ اس سے سدھا کو ایک کوفت سی ہونے لگی تھی۔

ایک تو وہ بڑا بدصورت تھا۔ کسی زمانے میں اس کا رنگ گورا ضرور ہوگا۔ مگر اب تو پرانے تانبے کا سا تھا۔ مسلسل شراب نوشی سے نیلی دریدوں کا سا جال پھیلا تھا۔ اور سدھا کو اپنے نئے مینیجر کی ناک دیکھ کر ہمیشہ گمان ہوتا کہ یہ ناک نہیں ایک انجیر ہے جو ابھی باتیں کرتے کرتے اس کے سامنے پھٹ جائے گا اس کے گال جبڑوں پر لٹک گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ سر کے بال اڑ گئے تھے۔ اور جب وہ بات کرتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڈھا مینڈک کسی کائی بھرے تالاب کے اندر سے بول رہا ہو۔ عجیب سی گھن آتی تھی سدھا کو اس سے۔

مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہیڈ اسٹینو بن چکی تھی اس لیے اسے دن بھر اس مینیجر کے کمرے میں ہی رہنا پڑتا۔ جب بھی سدھا اس مینیجر کو دیکھتی تو اس کو گمان ہوتا کہ کہیں نہ کہیں اس نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ لیکن اسے یاد نہیں آتا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ بانٹنے کے بعد اس مینیجر نے سدھا کو کسی کام سے روک لیا۔ سدھا اس کے سامنے میز پر بیٹھی تھی۔ اس نے شراب پیتے ہوئے سدھا کو کچھ بتانا چاہا۔ لیکن سدھا اس کی اس حالت کو دیکھ کر اٹھ کر جانے لگی تو مینیجر نے اسے منت کر کے روکا اور اس کے باپ اور اس کے پرانے مکان کے بارے میں تصدیق کرنی چاہی۔ اس پر سدھا بڑے گھٹن بھرے لہجے میں ہاں بولی۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مینیجر نے کہا میں تمہارے گھر آیا تھا۔ تمہیں دیکھنے کے لیے تب تم اس وقت ایسی نہیں تھی لیکن اب تم ایک خوبصورت عورت بن چکی ہو۔ سدھا سوچنے لگی کب یہ میرے گھر آیا تھا۔ تب اس مینیجر نے ہی دھیرے سے کہا میں موتی ہوں۔ اب تو سدھا سناٹے میں آ گئی۔ وہ آگے کہنے لگا:

''میں بڑا بدنصیب تھا جو تم سے شادی نہ کی ۔۔۔۔ میں تمہیں اچھی طرح سے دیکھ نہ سکا۔ ان چند لمحوں میں کوئی کیا جان سکتا تھا۔ کیوں کہ ایک صورت جلد کے اندر بھی تراشیدہ رہتی ہے ۔۔۔۔۔ میں نوجوان تھا۔ دولت اور گورے رنگ کا لالچی۔ جو بیوی مجھے ملی وہ دولت بھی لائی تھی اور سفید چمڑا بھی، اور اس کے ساتھ ایک مغرور، بدمزاج، ظالم اور بے وفا طبیعت بھی لائی تھی۔ چند سالوں میں ہی میرے پانچ بچے ہو گئے۔ ان میں سے کتنے میرے تھے؟ میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے تھے۔ اور میں سنتا تھا۔ میری ان آنکھوں کا جو تمہیں پہچان نہ سکیں ۔۔۔۔ میری آنکھوں نے ایک ہیرا دیکھا اور پتھر سمجھ کر پھینک دیا۔۔۔۔ کیا تم مجھے کسی طرح معاف نہیں کر سکتیں؟''

سدھا تو اس کو پھٹی نگاہوں سے دیکھتے جا رہی تھی۔ اس کے دل میں جیسے کسی نے تیر مار دی ہو۔ وہ اندر سے تڑپ اٹھی تھی۔ وہ دل میں سوچنے لگی تم اب آئے ہو؟ میں نے اپنی زندگی کی نہ جانے کتنی بہاریں تمہارے نام کر دیں اپنی ساری جوانی تمہارے نام کر دی۔ اپنے ماں باپ کے ارمانوں کا خون کر دیا۔ اپنے بچوں کو کوکھ میں نہ لا سکی وہ مجھے دور سے بلاتے رہے۔ میں نے تم سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ نہ شادی، نہ سہاگ رات، نہ بچے۔ صرف ایک تصور تم سے مستعار لیا تھا۔ اور آج تم اسے بھی چھیننے چلے آئے۔ سدھا یہ سب سوچتے ہوئے میز پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اور جب موتی نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ غصے سے جھنجھلا کر اس کا ہاتھ جھٹک کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ روتے ہوئے سڑک پر جا پہنچی۔ آگے بڑھی تو سامنے آصف علی پارک دکھائی دیا۔ ''ایک لمحے کے لئے اسے خیال آیا کہ وہ پارک کے اندر جا کر، کسی پیڑ کے تنے سے سر ٹیک کر بیٹھ جائے۔ مگر پھر اس نے سوچا'' بے سود ہے، سب بے سود ہے، میرے خیالوں کا شہزادہ اب وہاں نہ آئے گا۔ اب وہ کبھی میرے پاس نہ آئے گا۔'' یہ سب سوچتے ہوئے ہی اس نے اپنی مانگ کا سندور مٹا دیا سہاگ کی بندیا کھرچ دی اور پارک کی ریلنگ سے اپنی ساری چوڑیاں توڑ ڈالی۔ اب اپنے آپ کو ساری زندگی کے لیے بیوہ سمجھنے لگی۔

اس طرح کرشن چندر نے اس کہانی میں سدھا کے ذریعے ان مظلوم لڑکیوں کی روداد بیان کر دی ہے جو نہ جانے کب سے ظاہری خوبصورت اور جہیز کے نام پر اپنا سب کچھ کھوتی آ رہی ہیں۔

☆☆☆

انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا شاعر: ساحر لدھیانوی

محمد محتشم

(ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔ موبائل: 8795255751)

مجھے معلوم ہے انجام رودادِ محبت کا
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعیِ رائگاں کر لوں

ترقی پسند تحریک کے مقبول قلم کار، انقلابی شاعر اور نامور گیت کار ساحر لدھیانوی کا یہ شعر ان کی انسٹھ سالہ زندگی کے نشیب و فراز کی سچی تصویر پیش کر رہا ہے۔ ساحر فقط پل دو پل کے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ کبھی کبھی ان کے غیرت مند دل میں یہ نیک خیال بھی گزرتا تھا کہ اگر وہ صبر و تحمل کے ساتھ شترِ وفا کیش پر سوار ہو کر کاروانِ اخلاص و محبت کی تلاش میں نغموں کی جھولی پسارے نکلے تو نہ صرف یہ شجر و حجر، وحوش و طیور، شمس و قمر، قوسِ قُزح اور کائنات کا ذرہ ذرہ خوشی سے سرشار ہو کر جھوم اٹھے گا بلکہ پیکرِ خاکی کو بھی امن و آشتی اور تہذیب و تمدن کی بھیک مل جائے گی حتیٰ کہ اس کے اندر سے بغض و حسد، بخل و حرص، طمع و ہوا، کِبر و نَخوَت، یاس و حسرت، رنج و ملال، نفرت و عداوت، خشونت و رعونت اور خود غرضی و خود ثنائی جیسے تمام خصائلِ رذیلہ اور صفاتِ مذمومہ کا خاتمہ ہو جائے گا، جن کی وجہ سے انسانیت داغ دار اور رسوا ہوتی ہے۔

قارئینِ باتمکین اس قلم فرسائی سے یہ زنہار خیال نہ فرمائیں کہ ساحر ایک مذہبی، اصلاحی اور تبلیغی آدمی تھے، جنہوں نے شعر و شاعری کو محض لوگوں کی اصلاحِ نفس اور تزکیۂ قلب کا ذریعہ بنا لیا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی ہماری طرح ایک عام انسان تھے لیکن ان کے سینے میں ایک دھڑکتا دل تھا اور اس دھڑکتے دل میں دنیا جہاں کے بہت سے رنج و الم نے بسیرا کر رکھا تھا۔ انہوں نے غمِ جہاں اور رنجِ دنیا کو کبھی بھی اپنی کمزوری نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ اسے اپنا مضبوط اور دفاعی ہتھیار مانا اور بڑی خوب صورتی سے اسے شعری قالب میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں، اپنی تخلیق کے مقاصد کو سمجھیں اور عامیانہ روش اور مخربِ اخلاق کارناموں سے تائب و کنارہ کش ہو کر ملک کی خدمت، اس کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبودی کے لیے کام کریں۔

یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ شخص جس کو ایسی باکمال شاعرانہ صلاحیت ودیعت کی گئی، یقیناً وہ شاعرِ کامل العِیار اور نادرِ روزگار ہوگا۔ ساحر لدھیانوی نہ صرف ایک اچھے شاعر، بہترین غزل خواں اور شاندار نغمہ نگار تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے اور عالمِ انسانیت کی فلاح و معراج کے لیے ہمہ وقت کوشاں اور مسلسل غور و فکر میں غوطہ زن رہنے والے تحریر و قلم کے بے باک مجاہد تھے۔ ان کی شاعرانہ اور ناصحانہ زندگی کی کامل جھلک پورے جلوہ سامانیوں کے ساتھ ان چار مصرعوں میں موجود ہے۔

یہ خواب ہی تو اپنی جوانی کے پاس تھے
یہ خواب ہی تو اپنے عمل کی اَساس تھے
یہ خواب مر گئے ہیں تو بے رنگ ہے حیات
یوں ہے کہ جیسے دستِ تہ سنگ ہے حیات

ساحر نے نہ صرف اپنی جذباتی تقریروں اور ولولہ انگیز بیانوں کے ذریعے انگریزی حکومت اور سامراجی نظام کے خلاف کسانوں، مزدوروں اور باشندگانِ وطنِ عزیز کو برسرِ پیکار ہونے کے لیے آمادہ کیا تھا بلکہ اپنی انقلابی نظموں، حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اپنی شعری تخلیقات کے ذریعے بھی عوام کے دلوں میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کا کام کیا تھا۔ ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف گنگا جمنی تہذیب کی شاندار

جھلک، انسان دوستی کے بہترین عناصر، اقدار و روایات کی اہمیت و افادیت اور ہمارے اسلاف کی پرشکوہ وراثت کی زبردست آب و تاب نظر آتی ہے تو وہیں دوسری طرف برطانوی نظامِ سیاست کی پر زور انداز میں مخالفت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

آپ کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوگی کہ یہی وہ بنیادی خوبیاں ہیں جو ان کو ایک بے مثال شاعر، لازوال فن کار، اچھا قلم کار، بہترین انسان اور انسانی اقدار و کمالات کا بہترین ترجمان بناتی ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ انہوں نے جوہرِ تخلیق سے نہ صرف اپنا قلم آراستہ کیا تھا بلکہ اپنی تخلیقی انفرادیت کا ایسا جال بچھایا تھا کہ اس کے سحر سے آج تک دمِ سحر بھی نہیں نکل سکا۔

اب ہم نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ ان کی شعری نگارشات اور قلمی تحریرات کا سنجیدگی سے غائرانہ مطالعہ کر کے ان کی زندگی کے وہ پنہاں حقائق تلاش کرنے کی جہدِ مسلسل کریں گے جنھوں نے نہ صرف ساحر کو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا شاعر بنا دیا تھا بلکہ ان کے باوقار وجود کو ہمیشہ کے لیے ہماری نگاہوں میں محترم و مکرم اور ان کی دل نواز اور بت شکن جیسی قابلِ رشک شخصیت کو ادبی حلقے اور اردو دنیا میں انسانیت نواز کا شاعر بنا دیا تھا۔

ساحر لدھیانوی عورت ذات کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ ظالم معاشرے میں ان کے جائز مطالبات کی باز یافت کے لیے اس وقت تک انتھک کوششیں کرتے جب تک کہ کوئی مضبوط لائحہ عمل تیار نہ کر لیا جاتا۔ ایسا غالباً اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے اپنی والدہ کو راتوں کی تنہائی میں غمِ فراق میں آنسو بہاتے، حصولِ رزق کے لیے سامانِ زیب و آسائش فروخت کرتے، لوگوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتے اور عوام و خواص کے زہریلے لب و لہجے کا نشانہ بنتے دیکھا تھا نیز یہ کہ کس طرح ظالم سماج اکیلی خاتون کو تنِ تنہا اور کمزور سمجھ کر چیل کوے کی طرح نوچ کھانے کو دوڑتی ہے اور کس طرح خود کو معزز و مکرم تصور کرنے والی قوم موقع ملتے ہی بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتی ہے اور اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر اس کی عزت تار تار کر دیتی ہے۔ مزید یہ کہ ساحر خود بھی ایک زخمی عاشق تھے، کئی بار ان کا دل معشوقاؤں کے ہاتھوں بری طرح ٹوٹ چکا تھا اور مرغِ بسمل کی طرح درد کے مارے اندر ہی اندر تڑپ رہے تھے۔ انھی تمام اہم نِکات پر روشنی ڈالتے ہوئے ساحر نے اپنے ایک انٹرویو میں سماجی بندشوں کے سبب عورتوں کی محرومی کو معاشرے کی چیرہ دستیوں کا نتیجہ قرار دے کر واضح الفاظ میں یہ کہا تھا:

> ''ہمارا سماج ایک جنسی سماج ہے۔ یہاں مرد کا بول بالا ہے، اس لیے ہمارے یہاں کی عورتیں مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول نہ رکھنے کی وجہ سے محبت کے گورکھ دھندے سے دور رہتی ہیں اور اگر کوئی عورت بھولے بھٹکے محبت کر بھی لے تو سماج کی بندشیں اتنی مشکلات پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ اکثر بے وفائی کر کے اپنی جان چھڑاتی ہے۔''(1)

یہ بات صد فی صد سچ ہے کہ اس انٹرویو میں ساحر نے وہی سب کچھ بتایا جن سے وہ گزر چکے تھے۔ انھیں برندر کور سے عشق کے جرم میں نہ صرف کالج سے نکال دیا گیا تھا بلکہ برندر کور کو بھی لوگوں کی تلخ آمیز باتیں سننی اور ذہنی و جسمانی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساحر نے محض وہی سب کچھ کہا جو ان پر بیت چکی تھی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی آپ بیتی کو اس طرح پیش کیا کہ اس میں پورے جگ کی عورتوں کی تکلیف دہ زندگی کے تاریک پہلو، ان کی روح سوز سسکیاں اور سماجی ٹھیکے داروں کی مکاریاں نظر آنے لگیں۔ ہم چاہے جتنی بھی ترقی کر لیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ آج بھی عورتوں کے ساتھ پہلے جیسا ناروا سلوک کیا رہا ہے۔

مشرقی تہذیب و فضا میں عورت کا وجود نہ صرف ہمیشہ سوالوں کے گھیرے میں رہا ہے بلکہ اسے محض جسم و جاں کی تسکین کا ذریعہ سمجھ کر باندیوں جیسا سلوک ان کے ساتھ صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔ ساحر نے اس فاسد خیال اور باطل نقطۂ نظر کی پورے شد و مد کے ساتھ مخالفت کی اور معاشرے میں عورتوں کا وہ مقام دلانے کی طرف پہل قدمی کی جس کی وہ مستحق تھی۔ ساحر کی طنزیہ اور حقیقت پر مبنی نظم ''عورت نے جنم دیا

مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا'' کے چار مصرعے ملاحظہ کریں!

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا دھتکار دیا
مردوں کے لیے ہر ظلم روا عورت کے لیے رونا بھی خطا
مردوں کے لیے ہر عیش کا حق عورت کے لیے جینا بھی سزا

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کے خیالات و نظریات کی عکاسی کرنے والی نظم ''جواہر لعل نہرو'' صرف فردِ واحد کی موت کا نوحہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ہندوستانی سماج کی وہ واضح تصویر نظر آتی ہے جو کہ کسی حد تک ہماری نگاہوں سے چھپی ہوئی تھی۔ اس نظم میں جواہر لعل نہرو کے خیالات کے در پردہ ساحر نے اپنے ان نظریات کی نہایت چابک دستی سے ترسیل کی ہے جو سماجی نظام کی تبدیلیوں میں معاون اور اشتراکی معاشرے کی تشکیل میں مددگار ہیں۔ اس نظم میں جہاں ایک طرف قومی ہم آہنگی، اتفاقِ باہمی، بشری تقاضے اور انسانی عظمت و رفعت کا شدید احساس نمایاں ہے تو وہیں دوسری طرف طبقاتی تضادات کے خلاف معاشرتی انقلاب کا پیغامِ جاں فزا بھی جلوہ گر ہے۔

ساحر لدھیانوی کی فکری جَودت اور ذہنی ارتقا کا شاہ کار نمونہ درج ذیل دو بندوں میں ملاحظہ کیجیے کہ وہ کس طرح اپنے جو شیلے اندازِ بیان، خوب صورت لب و لہجہ، آسان لفظوں کے انتخاب اور دل کش استعارات و ترکیبات کے حسنِ استعمال کی بہ دولت بے جان جسم میں بھی حریت و بقا کی تلاطم خیز لہریں پیدا کر دیتے ہیں۔

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے
دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مر جاتے
ہم مٹا ڈالیں گے سرمایہ و محنت کا تضاد
یہ عقیدہ، یہ ارادہ، یہ قسم لے کے چلو
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

نظم ''بڑی طاقتیں'' جو محض دو شعر یعنی چار مصرعوں پر مشتمل ہے لیکن معنی و مفاہیم کے اعتبار سے اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے کہ ایک کوزے میں پورا کا پورا سمندر سما دیا گیا ہو اور اس کی تہ میں اترنے والا بخت آور غواص علم و حکمت کے موتی تلاش کر کے اپنا خالی دامن بھر لیا ہو۔

تم ہی تجویزِ صلح لاتے ہو
تم ہی سامانِ جنگ بانٹتے ہو
تم ہی کرتے ہو قتل کا ماتم
تم ہی تیر و تُفنگ بانٹتے ہو

آپ اس نظم کا بہ غور تجزیاتی مطالعہ کریں یا نہ کریں لیکن پھر بھی اس نظم کے ذریعے ساحر لدھیانوی جو اہم پیغام دینا چاہتے ہیں وہ دودھ کی طرح بالکل صاف اور جگ ظاہر ہے۔ انہوں نے اسلحہ ساز ممالک کو عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن مانا ہے جو درہم و دینار کے لیے قتلِ انسانی کو جائز ٹھہرا کر پوری دنیا کو جنگ کی نذر کر دیتے ہیں۔ انہوں نے بے خوف و خطر اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اصل قاتل و گنہ گار وہ ممالک نہیں ہیں جنہوں نے بنی آدم و بنتِ حوا کا خون پانی کی طرح بہانے کے لیے بھاری رقم دے کر ہتھیار و بم بارود خریدے بلکہ اصل قصور وار تو وہ اسلحہ فروش ممالک ہیں جنہیں لوگوں کے زندہ رہنے اور مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جنہیں عالمِ انسانیت کا درد و کرب محسوس نہیں ہوتا اور جنہیں انسانوں کا قتلِ عام دیکھ کر روحانی سکون ملتا ہے۔ سچ کہا جائے تو یہ انسان ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو انسانی لباس میں انسانی جانوں کے سوداگر اور انسانوں کی بستی میں انسانی لباس پہن کر چلتے پھرتے سفاک درندے ہیں۔

اسی طرح ساحر کی نظم خون پھر خون ہے اپنی جگہ ایک جہانِ معنی تو رکھتی ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ نظم ان کی زبان و بیان کا اعلا نمونہ، انوکھی لفظیات کی اثر آفریں صورتِ اظہار اور نرالے استعارات کا بہترین شاہ کار ہے۔ ساحر نے اس نظم میں نہ صرف ظلم و استحصال اور جبر و تشدد کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے بلکہ ظلم کی نحوست سے ظالموں کو خبردار کرتے ہوئے اس کے انجامِ بد سے انھیں متنبہ کیا اور یہ بتایا کہ ظالم چاہے جتنا بھی ظلم و ستم کر لے، ایک نہ ایک دن اسے اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی اور اس کا ایسا حشر ہوگا کہ قیامت بھی اسے مبتلائے دہشت و نکبت دیکھ کانپ اٹھے گی۔

اس نظم کے ذریعے ساحر لدھیانوی ایک اور نہایت اہم پیغام یہ دینا چاہتے ہیں کہ جب تک ہم متحد اور باہم شیر و شکر رہیں گے تو بڑی سے بڑی طاقتیں بھی ہمارا مقابلہ نہیں کر پائیں گی لیکن جس دن ہمارا

شیرازہ منتشر ہو گیا تو سمجھ لیں کہ اس دن سے ہماری حیثیت بن پانی کے مچھلی جیسی ہو جائے گی۔ گویا کہ وہ یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اتحاد زندگی ہے اور اختلاف موت۔

ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے، سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

یہ ساحر کی وہ نظمیں ہیں جن میں جنگ کی ہولنا کیوں، اس کے نقصانات اور خوفناک نتائج کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر کبھی جنگ کی صورت پیش آ جائے تو پشت دکھا کر ہمیں راہِ فرار اختیار نہیں کرنا ہے بلکہ جواں مردی کے ساتھ بڑی طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہنا ہے، ظالم و جابر قوم کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے اور مضبوط چٹان کی طرح ثابت قدم ہو کر انھیں للکارنا ہے اور ساتھ ہی جنگ و جدال کے برے اثرات سے انھیں باخبر کرتے ہوئے امن و شانتی کے قیام کی دعوت دینا ہے نیز وہ جو اپنے ملکی مفاد اور شخصی برتری کی خاطر لوگوں کو جنگ جیسی ہلاکت خیز گھاٹیوں میں ڈال دیتے ہیں، لوگوں کو ان سے بچنے، اختلافات کی دیواریں توڑنے اور جنگی صورتِ حال کو ناکام بنانے کی کوشش کرنا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور معنیٰ خیز نظم ''اے شریف انسانو!'' ہے جو 1965ء کی ہند و پاک جنگ کے تناظر میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم کے ذریعے ساحر نے دیدہ دلیری کے ساتھ جنگ سے پیدا شدہ الم ناک نتائج، انسانی جمعیت کا شیرازہ بکھیرنے والے بھوک و احتیاج جیسے پیچیدہ ترین مسائل اور انسانی اقدار کی پامالی کی دردناک تصویریں ذہن انسانی اور قلبِ مرداں پر مرتسم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا اندازہ ان دو بندوں سے بہ حسن و خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

یہ نظم فلسفۂ جنگ و جدال کے دل کش پیرایے میں اخلاق و محبت کی داعی ہے۔ اس نظم میں نفرت و عداوت پر اخلاص و محبت کو اور جنون و بے خودی پر عقل و دانش کو فوقیت دی گئی ہے۔ اس نظم کے ذریعے عام و خاص تک یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عظمتِ انسانی کے حقوق کے تحفظ کی عظیم ذمہ داری، انسانیت کے اعلا اقدار کی بہ حالی کا حوصلہ بخش جذبہ، بشری تقاضوں کو پورا کرنے کا دلی عہد، قومی ہم دردی کا انمول احساس، حسنِ سلوک کا شوقِ وفور اور عجز و انکساری کا بلند مظاہرہ ہی خاکی پیکر کے لیے جہانِ آب و گل میں بیش بہا سرمایہ ہے اور اس کی حفاظت و صیانت کا ہمیں امین و پاسبان بنایا گیا ہے۔

بہ ایں ہمہ محولہ بالا نظموں کا تعمیراتی پہلو ساحر کی وطن دوستی، حب الوطنی، قومی یک جہتی، سماجی ہم آہنگی، باہمی بھائی چارگی اور ملی ہم دردی ہی نہیں بلکہ ان کے جذب؟ ایثار و اخلاص اور ان کے تصورِ حیاتِ انسانی کا بھی شاندار مظہر ہے۔ ان نظموں میں روحِ عصر کی جلوہ گری ساحر کی عصری حسیت، تعینِ مقصدِ حیات کی معنویت اور تاریخی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

ساحر کے شہرۂ آفاق مجموعہ کلام ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' پر رائے زنی کرتے ہوئے پروفیسر شافع قدوائی رقم طراز ہیں:

''اس مجموعے کا خالق ماضی سے گریزاں اور حال سے ناآسودہ ہے، جو سماجی ناانصافیوں اور نابرابریوں کے خلاف مستقل جہاد کرتا رہا ہے اور اندر ہی اندر ٹوٹتا اور بکھرتا رہا ہے۔ اس مجموعے کی شعری تخلیقات میں محاکاتی اور تجسس آمیز کیفیت بہ درجہ اتم موجود ہے۔''(2)

پروفیسر شافع قدوائی کا یہ اقتباس دو جملوں پر مشتمل ہے: پہلا

جملہ (جو کہ ہمارا مطلوب و مقصود بھی ہے۔) اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایسے انسانیت سوز حالات و ماحول سے ساحر جیسے ذکی الحس، جذباتی اور انسانیت دوست شخص کا بغاوت کر جانا فطری عمل تھا؛ کیوں کہ وہ ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی غلامی کا اثر پوری قوم کی تباہی و تنزلی میں دیکھ رہے تھے۔

ان کا دوسرا جملہ اس بات پہ دال ہے کہ ساحر کی شاعری جذبے کے خلوص اور احساس کی شدت کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی، تخیل کی بوقلمونی، موضوعات کے تنوع اور سادگی و سلاست سے آراستہ ہے اور نہ صرف لب ولہجہ کے اعتبار سے ہی منفرد ہے بلکہ اندازِ بیان کے لحاظ سے بھی روایتی شاعری سے یک سر مختلف ہے۔

ڈاکٹر ناز صدیقی ساحر لدھیانوی کی ہمہ جہت تخلیقی کاوشیں، تعمیری نظریات، نشاطِ کرب کی لطافتوں اور عشق کی سرمستیوں میں سَنی ان کے دو آتشہ کلام اور شعری جمالیات سے بے حد متاثر تھیں۔ وہ اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتی ہیں:

> ''ساحر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے جس مثالی دنیا کی تصویر سامنے آتی ہے، وہ ایک اشتراکی اور غیر طبقاتی معاشرہ ہے جن میں ایک طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال نہیں کرتا، جو غلامی، جہل اور اِفلاس کی لعنتوں سے پاک ہے، جس میں مذہب کے نام پر لوگ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاتے، جہاں اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے بھوکے بھکاریوں کی صدائیں نہیں گونجتیں، جہاں پر پیچ گلیوں اور بے خواب بازاروں میں عصمت کے سودے نہیں کیے جاتے، جہاں بھوک اور پیاس سے لوگ سسک سسک کر اپنی جان نہیں دیتے اور جہاں سامراجی ملک اپنے استحصالی مقاصد کی تکمیل اور اپنے وجود کی بقا کے لیے عالمِ انسانیت کو جنگ کی آگ میں نہیں جھونکے۔''(3)

اس مُتذکّرہ بالا اقتباس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ساحر نے اپنی توانا فکر کو غمِ عشق کے احساس کے ساتھ ساتھ حیات و معاشرت کے بنیادی مسائل یعنی نسلِ انسانی کے کرب، طبقاتی تضاد، غلامی و آزادی کے سوالات و جوابات اور عورتوں کے اس دوجہتی استحصال سے وابستہ کر رکھا تھا۔

ساحر کی شاعری میں غریبوں کا دکھ درد، ماحول کی کشمکش، سماج کی خستہ حالی، مناظرِ فطرت کی رنگین بیانی اور کارخانہ قدرت کی رعنائی کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ ان کی شاعری ان کے تجربات کا جلوہ گاہ ہے جہاں ہر شخص اپنا عکسِ جمیل بہ آسانی دیکھ سکتا ہے۔ ان کے جذب؟ حریت نے جہاں ایک طرف تمام سیاسی جماعتوں کو بیدار مغزی کا شرابِ طہور پلا کر ان کے اندر سماجی انقلاب کے سرد مُہر احساس کو مہمیز کیا تو وہیں دوسری طرف جدید فکری قوتوں کی بہ دولت طبقاتی روابط اور سماجی تعلقات کا شعور گہرا کیا۔

مزید یہ کہ انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کا ادراک عقل کی روشنی میں کیا اور اقتصادی بدحالی، سماجی ناانصافی اور سیاسی غلامی کے پیشِ نظر زندگی اور ادب کے تعلقات اور ادب کے ذریعے زندگی کے مسائل سے متعلق نہ صرف غور و فکر کی راہیں ہموار کیں بلکہ انقلاب آفریں نغمات کے ذریعے قوم کی بیداری کا بھی کام کیا۔

مجنوں گورکھپوری کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

> ''شاعری کا تعلق ابتدا ہی سے حیاتِ انسانی کے اغراض و مقاصد کی فلاح و ترقی سے ہے۔ ساحر لدھیانوی کی شاعری پر یہ جملے صادق آتے ہیں۔ ان کی نظمیں بڑی ہنگامہ خیز اور انقلاب آفریں ثابت ہوئیں۔ ان کا انسانیت کے مستقبل پر کامل اعتماد تھا۔ وہ ذہنی، سیاسی اور اقتصادی مساوات کے علم بردار تھے۔ ان کے کلام میں احساس کی شدت بے پناہ ہے۔''(5)

ساحر لدھیانوی پہلا ایسا شاعر گزرا ہے، جس نے ڈنکے کی چوٹ پر شعر و شاعری اور نغمہ نگاری کے ذریعے عوام کی باتیں عوام کی زبان میں عوام کے سامنے رکھیں۔ ساحر نے بغیر ہچکچاہٹ کے غلط کو غلط کہا اور حق و صداقت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ساحر کی ان فکری

قوتوں اور تاریخ ساز اقدام کا اعتراف ان کے ہم عصر مقبول نغمہ نگار جاں نثار اختر نے بھی کیا وہ کہتے ہیں:

اس نے فلموں کو ایسے گیت دیے جو سیاسی اور سماجی شعور سے لبریز ہیں۔ وہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح فلمی دنیا کی گندگی میں ڈوب کر نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس نے اپنے قلم کی قوت سے فلمی گیتوں کو اگر ایک طرف حسن کی لطافت و نزاکت اور عشق کا درد و کسک بخشی ہے تو دوسری طرف سماجی، مادی اور اقتصادی شعور دیا ہے۔ اس نے خود کو دھوکہ دیا، نہ اپنے فن کو، نہ ترقی پسند تحریک کو اور نہ عوام کو۔ اس نے وہ کیا جو بہ حیثیتِ ایک بیدار شاعر اس کا فرض تھا۔(6)

غزل جسے عشق و عاشقی کا خوب صورت میدان اور محبوباؤں سے رمز و کنایہ میں بات کرنے کا ایک بہترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن جب ساحر نے غزل کی سنگلاخ وادی میں قدم رکھا تو اسے عشق و عاشقی کے دائرے تک محدود رہنے نہیں دیا بلکہ حیات و ممات، امید و بیم اور اخلاص و وفا جیسے شاندار مضامین سے اسے گلِ گلزار بنا دیا۔

ڈاکٹر انور ظہیر انصاری انسانیت نواز ممتاز شاعر ساحر لدھیانوی کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے ہوئے خامہ فرسائی کرتے ہیں: لہٰذا غزل ان کے یہاں لغوی معنی و مفاہیم کی بہ جائے روحِ عصر کی جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عشقیہ خیالات کے اظہار میں بھی عصری مسائل ابھر آئے، جسے ہم ساحر کی عصری حسیت و آگہی سے تعبیر کر سکتے ہیں جو رومانیت کی رنگینیوں سے حقیقت کی سنگینیوں کی طرف چلی جاتی ہے۔

عظمتِ انسان کا یہ تصور ساحر کے تاریخی و سماجی شعور کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں کی اساس بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ انسان غم زدہ اور شکست خوردہ ہونے کے باوجود خوددار بھی ہے اور حالات کی قید و بند سے نبرد آزما بھی۔

معمورہ ٔاحساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہ
جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے (7)

ساحر لدھیانوی نے حساس و غیر حساس مسائل پر بہت سی نظمیں، غزلیں اور فلمی نغمے لکھے ہیں اور اپنی ہر ایک تخلیق و تحریر کے ذریعے ترسیل و تبلیغ کا کام اچھے طریقے سے لیا ہے۔ ساحر نے جب 1955ء میں ایک سو نوے مصرعوں کی اپنی سب سے طویل نظم "پرچھائیاں" لکھی تو نئی نسل کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''پرچھائیاں'' میری پہلی طویل نظم ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں امن اور تہذیب کے تحفظ کے لیے جو تحریک چل رہی ہے، یہ نظم اس کا ایک حصہ ہے۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے، وہ آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوب صورت دنیا دے کر جائے۔ میری یہ نظم اس کوشش کا ادبی روپ ہے۔''(8)

جو چیز کہ شعر کو شعر بناتی ہے اور چشمِ تماشا کو ذوقِ نظارہ سے آشنا کرتی ہے، وہ شخصیت نہیں ہے بلکہ شاعری کا شعری عمل ہے اور ساحر کی شاعری اس خوبی پہ سو فی صد کھری اترتی ہے۔ ابتدا ہی سے ان کی شاعری کا مرکز عوام تھے اور عوام کی خوش حالی اور سماجی انصاف کے لیے عمر بھر سرگرداں رہے۔ یہی معاملات و مسائل اور تجربات و حوادث ساحر کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں جنہوں نے ان کی شعری و ادبی شخصیت کی تشکیل و تعمیر اور انھیں انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا شاعر بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

اردو ادب کا یہ چمکتا دمکتا ستارہ اور فلمی دنیا کا یہ نیر تاباں 1921ء کی روشن صبح لدھیانہ کے افق سے طلوع ہو کر ہر سو علم و ادب کی روشنیاں بکھیر تا 1980ء کی ایک قیامت خیز شام ممبئی کی سرزمین پر پہنچ کر ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

☆☆☆

رونق جمال: ایک شش جہتی فنکار

فردوس انجم

(اقبال نگر، بلڈانہ، مہاراشٹر۔ موبائل:9960922510)

معروف نقاد آل احمد سرور کا مشہور قول ہے کہ "ادب انقلاب نہیں لاتا بلکہ انقلاب کے لیے ذہن کو بیدار کرتا ہے۔۔۔" ذیل کے سطور میں ایک ایسی ہی بیدار ذہن اور انقلابی جذبے سے سرشار شش جہتی فنکار "رونق جمال" کی خدمات کو احاطۂ تحریر میں لانے کی سعی کی گئی ہے۔

رونق جمال کا تعلق مہاراشٹر کے برار علاقے میں واقع امراوتی ضلع کے ایک قصبے "کھولا پور" کے نواب گھرانے سے ہے۔ علاقہ برار زمانۂ قدیم سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس علاقے نے کئی نامور شاعر اور اعلیٰ پائے کے قلم کار اردو ادب کو دیئے ہیں۔ ان ہی نامی گرامی قلم کاروں میں ایک اہم نام رونق جمال کا بھی ہے۔ رونق جمال کی پیدائش 25 مئی 1954 کو جلگاؤں مہاراشٹر میں ہوئی۔ آپ کا خاندانی نام نواب غلام احمد جمال ہے اور قلمی نام رونق جمال۔ آپ کی ابتدائی تعلیم کھولا پور میں ہی ہوئی۔ جبکہ ہائی اسکول سے گریجویشن تک کی تعلیم امراوتی سے اور پوسٹ گریجویشن (اردو، فارسی) ناگپور یونیورسٹی سے ہوئی۔ رونق جمال ایک پروقار شخصیت و سراپے کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت میں نوابی رنگ کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کاروباری سلسلے سے آپ دُرگ (چھتیس گڑھ) آئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ آپ نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز 1972 سے کیا۔ حالانکہ آپ کے قلمی سفر کا آغاز دوران ابتدائی تعلیم ہی ہو گیا تھا۔ بچوں کے رسالے "نور" اور "کھلونا" میں آپ کی تخلیقات شائع ہونے لگی تھیں۔ ادبی دنیا میں آپ بطور افسانہ نگار، افسانچہ نگار، ڈرامہ نگار، مضمون نگار، ناول نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار اور ادیب اطفال اپنی انفرادیت منوا چکے ہیں۔ اتنا ہی رونق جمال کو ایکٹنگ کا بھی شوق ہے۔ یہ شوق انھیں ممبئی بھی لے گیا تھا۔ حالانکہ حقیقت شناسی طبیعت میں ہونے کی وجہ سے بہت جلد انھوں نے وہاں سے اپنا راستہ علاحدہ کر لیا۔ فی الحال دُرگ میں پولٹری فارم کا کاروبار کرتے ہیں۔ فارم پر ہی ایک لائبریری بنائی ہے، وہیں سے سارے کام کاج کو سنبھالتے ہیں اور پرورش لوح و قلم میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اداکاری کا شوق برقرار ہے۔ اپنے اس شوق کی تکمیل چھتیس گڑھ کی علاقائی زبان کی فلموں میں اداکاری کر کے کیا ہے۔ ڈرامہ نگار تو وہ ہیں ہی، ڈرامہ نگاری کے ساتھ ساتھ اپنے ڈراموں کو اسٹیج بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی و فلاحی کاموں میں بھی سرگرم رہتے ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ وہ 16 گھنٹے کام کرتے ہیں۔ مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ عمر کے اس حصے میں دل کے بائے پاس سرجری کے باوجود 16 گھنٹے کام کرنا کیسے ممکن ہے۔ لیکن ان کے کام کرنے کے انداز کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ صرف رونق جمال جیسے بیدار اور انقلابی شخص ہی کر سکتے ہیں۔ دست بہ دعا ہوں کہ اللہ پاک انھیں ہمیشہ صحت یاب رکھے۔ آمین

رونق جمال کی پہلی محبت افسانہ نگاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے توسط سے ایک علاحدہ شناخت بنائی ہے۔ ان کے افسانے معاشرے کے نشیب و فراز کی عکاسی کرتے ہیں۔ اپنی کہانیوں میں وہ انسانی زندگی کے ایسے مخصوص پہلوؤں کو مختصر اور دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے زندگی کی حقیقتیں قاری کے سامنے کھل کر سامنے آتی ہیں۔ وہ اپنی فن پاروں میں خواب، خوشیاں، آرزوئیں، تمنائیں، خواہشات، تلخ حقائق کو اس طرح فنی صلاحیت سے پروتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر وہ گہرا و دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ رونق جمال پچھلی پانچ دہائیوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک ان کے جو افسانوں کے مجموعے شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں، ان میں "پھول کھلنے دو" (1985)، قوس و قزح (1986)، کورونا کے رنگ (2020)، عید کے دن کا بادشاہ (عید سے متعلق کہانیوں کا مجموعہ (2022، اہم ہیں۔ جن میں ایک لالچی، تابوت کی بے بسی، مجھے پڑھنے دو، جنت و دوزخ کے درمیان، وغیرہ نمائندہ افسانے ہیں۔

رونق جمال کے افسانوں کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہیں۔زبان پر قدرت حاصل ہے تو الفاظ نگینے کی طرح مزین اور آراستہ نظر آتے ہیں۔ ہلکے سے اشارے میں بڑی بات کہنے کا ہنر آپ میں موجود ہے۔مناسب علامتوں کا استعمال بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ان اشاروں اور علامتوں پر غور کرنے سے زندگی کے مسائل پر غور کرنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔آپ کے افسانے نہ صرف معاشرتی شعور کا احساس دلاتے ہیں بلکہ قاری کے ذہن پر انمٹ نقوش ثبت کر دیتے ہیں۔رونق جمال کی کہانیاں زندگی کی حقیقت سے قریب ہیں۔"کورونا کے رنگ" مجموعے میں آپ نے کورونا وبا کے تمام نکات پر اپنے قلم کو جنبش دی ہے۔اس مجموعے میں افسانچے، افسانے اور بچوں کے لیے بھی کورونا وبا سے متعلق کہانیاں موجود ہے۔ آپ اپنی کہانیوں کے ذریعے معاشرتی برائیوں کی طرف توجہ مرکوز کراتے ہیں؛ ساتھ ہی اخلاقی اقدار کی اہمیت کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔جس کی عمدہ مثال دوستی کی لاج، ضمیر کی نیند، فرشتے، ایثار، شریف آدمی، وغیرہ ہیں۔"تابوت کی بے بسی"، "ریزہ ریزہ غرور"، وغیرہ جیسے آپ کے افسانوی مجموعے زیر طبع ہیں۔

رونق جمال نے خصوصی طور پر افسانچہ نگار کی حیثیت سے بھی اچھی شہرت حاصل کی ہیں۔ بلکہ ان کا شمار صنفِ افسانچہ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔آپ تب سے افسانچے لکھ رہے ہیں جب ناقدینِ ادب اسے ایک باضابطہ صنف ماننے سے انکاری تھے۔ایسے ماحول میں بھی آپ نے اس کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔یہ آپ کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج افسانچہ بطور صنف مقبول عام و خاص ہو رہا ہے۔اب تک آپ کے چھ افسانچوں کے مجموعے "قتل کا موسم" 1984))، "زہریلے انسان" (ہندی افسانچے) 2006، "پنجرے کا آدمی" 2008))، "ادھورا آدمی" 2013))، "ابابلیں شرما گئیں" 2016))، "لکشمن کی آنکھیں" 2023))، داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ "جے شری رام" کے نام سے ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔آپ کے افسانچے فنی کسوٹی پر پورا اترتے ہیں۔خاص کر پنچ لائن جو افسانچہ کی روح سمجھی جاتی ہے، وہ قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔آپ کے افسانچے پڑھنے کے بعد یوں لگتا ہے کہ صفحہ پر تو کہانی ختم ہو گئی لیکن ذہن میں کہانی چل رہی ہے۔بطور مثال دو افسانچے ملاحظہ فرمائیں :

''ارمانوں کا خون: جہیز سماج کے غریب طبقے کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ ہزاروں لڑکیاں جہیز کا شکار ہو کر اپنی جوانی کو خیر باد کہہ رہی ہیں۔ آج ابراھیم سیٹھ کے گھر شہنائی گونجی تو ریشماں کے ارمانوں کا کوہ آتش فشاں بھڑک اُٹھتا ہے اور وہ دوڑ کر آئینے کے سامنے گئی اور سراپے پر نظر ڈال کر چہرے سے نظریں ہٹا کر بالوں پر ڈالی تو اسے لگا دیمک کا ایک غول اُس کی مانگ میں ڈیرہ ڈال چکا ہے۔! دیمک کو مانگ میں رینگتا دیکھ کر ریشماں کی رہی سہی امیدوں نے بھی ایک پل میں دم توڑ دیا۔!!!''

(لکشمن کی آنکھیں، رونق جمال، ص(35)

اور ابابیلیں شرما گئیں: اللہ نے دنیا کے بے ترتیب حالات کو دیکھ کر ابابیلوں کو حکم دیا۔ جاؤ جا کر تمام انسانوں کو ہلاک کر دو جس طرح تم نے میرے حکم سے وادی محشر میں بادشاہ ابرہہ، اس کے لشکر اور ہاتھیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔!! اللہ کا حکم ملنے پر بھی ابابیلیں حرکت میں نہیں آئیں تو اللہ نے ناراض ہو کر کہا: کیا تم بھی ابلیس کی طرح نافرمانی کر رہی ہو۔!؟ اللہ کی بات سن کر اور غضب ناکی دیکھ کر ابابیلیں کانپ گئیں اور گویا ہوئیں:

''اللہ تعالیٰ ہم تو تیرے حکم کے غلام ہیں، تیری نافرمانی کیسے کر سکتے ہیں، لیکن اس دور کے انسانوں کو ہلاک کرتے ہوئے ہمیں شرم آ رہی ہے! شرم آ رہی ہے!! وہ کیوں! اللہ تعالیٰ! ابرہہ بادشاہ سرکش تھا! اور اس کا لشکر اس کا غلام!! لیکن وہ پھر بھی ایماندار تھا، بہادر تھا، سچا تھا، دلیر تھا، انصاف پسند تھا، بے باک تھا لیکن ایمان کی دولت سے محروم تھا کیونکہ اس کے پاس رہنمائی کے لیے قرآن نہیں تھا۔لیکن اس دور کا یہ انسان ایمان کی

دولت سے مالا مال ہے اور اس کے پاس رہنمائی کے لیے قرآن بھی ہے!! اس کے باوجود آج کا یہ انسان بے ایمان ہے، بزدل ہے، چور ہے، زانی ہے، جواری ہے، شرابی ہے، لالچی ہے، بے رحم ہے، قاتل ہے، دھوکے باز ہے، مکار ہے، کمینہ ہے، مطلب پرست ہے، بے وفا اور دغا باز ہے!! یعنی وہ اپنی بداعمالیوں سے آپ خود ہی ہلاک ہو گیا ہے اور مردوں کو ہلاک نہیں کیا جا سکتا!!! اس لیے ہمیں شرم آ رہی ہے!!!''

(رونق جمال، اور ابابیلیں شرما گئیں، ص58)

رونق جمال صاحب نے اپنے افسانچوں میں زندگی کی مسرت اور بصیرت، غم و الم، مختلف واقعات و حادثات کو دلچسپ اور مختصر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانچے تجسّس سے پر ہوتے ہیں۔ وہ افسانچوں میں زندگی کی تصویر کشی کا فن جانتے ہیں۔ بحیثیت افسانچہ نگار آپ پلاٹ اور موضوع کا انتخاب دلچسپ اور پر اثر انداز میں کرتے ہیں جو کہ سماج کا بہترین عکاس ہوتا ہے۔ آپ کا مطالعہ و مشاہدہ نہایت وسیع و دقیق ہے جس کی جھلک صاف طور پر آپ کی تخلیقات میں نظر آتی ہے۔

رونق جمال نے ڈراما نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے ڈراموں کا مجموعہ ''ایک پریشان باقی انجان'' 2006 میں منظر پر آ چکا ہے۔ اس مجموعے میں شامل کئی ڈراموں کو اسٹیج بھی کیا جا چکا ہے۔ آپ کے ڈراموں کی خصوصیت یہ ہے کہ مکالمے چھوٹے اور آسان ہوتے ہیں، جنھیں اسٹیج کرتے ہوئے دقت نہیں ہوتی۔ دوسری یہ کہ حقیقت نگاری کا عکس ان میں صاف جھلکتا ہے، سماج میں پھیلی برائی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قاری کو بیدار کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ ڈرامہ ''گونج'' کو اس حوالے سے کافی شہرت حاصل ہے۔ جس کا پلاٹ بظاہر طنز و مزاح سے مزین معمولی مکالمات پر مشتمل نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت اس کے پردے میں ایک نہایت سنجیدہ، حساس اور اہم سماجی مسئلے (ایڈز) کی سنگینی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ڈرامے کا آغاز'' ڈاکٹر گھوڑ سوار'' اور کمپاؤنڈر کی ہلکی پھلکی نوک جھونک سے ہوتا ہے، جہاں مزاحیہ مکالمات کے ذریعے ایک ہسپتال کے عام ماحول کی عکاسی کی گئی ہے، مگر یہی طنز و مزاح بتدریج سنجیدہ پیغام کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ ڈرامے کا اصل موڑ ''شیر سنگھ'' کے داخلے سے آتا ہے، جو ایڈز جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر گھوڑ سوار، جو ابتدا میں ایک مزاحیہ کردار کے طور پر سامنے آتا ہے، یہاں ایک فکری رہنما بن جاتا ہے۔ وہ شیر سنگھ کو صرف ذاتی علاج کی ترغیب ہی نہیں دیتا، بلکہ اسے ایڈز کے حوالے سے عوامی شعور اجاگر کرنے کی تحریک بھی دیتا ہے۔ ''گونج'' کا بنیادی پیغام سماجی بیداری، صحت و احتیاط، اور انسانی برابری ہے۔ یہ ڈرامہ قاری و ناظر کو جھنجھوڑتا ہے کہ وہ لاعلمی، شرم، تعصب اور قدامت پرستی کی زنجیروں کو توڑ کر بیماریوں سے آگاہی اور سماجی بہتری کے لیے کام کریں۔

بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت بچوں کی نفسیات، ان کی عمر، سمجھ، ذہنی کیفیات اور دلچسپیوں کا خاص خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ رونق جمال کا مشاہدہ تو وسیع ہے ہی، بچوں کی نفسیات پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہے۔ بچوں کی کہانیوں کے حوالے سے وہ اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''کہانیوں میں یہی سب تو ہوتا ہے۔
حیرت، استعجاب، گھبراہٹ، سنسنی، خوشی، رنج و غم۔
تو پھر آگے بڑھو، بچوں کی دنیا کا یہی تو حسن ہے،
کھو جاؤ اس حسین دنیا میں، اس جادو نگری میں کیا
عجب ماحول ہے، بڑا رنگا رنگ، آنکھوں سے ہوتا
ہوا دل میں اتر جانے والا رنگ۔۔۔۔!!''

(سانپوں کی دنیا، رونق جمال، ص6)

اس بات سے عدم اتفاق کی گنجائش نہیں ہے کہ بچوں کی کہانیاں رنگا رنگ ہونی چاہئیں۔ یہ وصف رونق جمال کی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ کی کہانیاں دل کو مسحور کر دینے والی، عجب و دلچسپ ماحول سے لبریز، لطف سے بھرپور اور مزاح میں گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آپ کو کہانی کہنے کے فن پر دسترس حاصل ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے آپ کے مجموعے ''چالاک بجو کے'' (2011)، ''چھوٹا پولیس والا'' (2015)، ''سانپوں کی دنیا'' (2018)، ''ابا جان'' (2019)، ''مینڈک کی وفاداری

"(2021)،اس کے علاوہ بچوں کے لیے ایک ناول "چاند کنارے" (2013) بھی قارئین سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں۔"لال کتاب" اور "بچوں کی عدالت" (بچوں کے ڈراموں کا مجموعہ) زیر ترتیب ہیں۔آپ کی کہانیاں بچوں کے لیے تفریح کے ساتھ ساتھ ان کی کردار سازی، شخصیت سازی اور اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے میں معاون ہیں۔اسی طرح ان کی مختلف کتابوں کو مختلف اکادمیوں سے انعامات مل چکے ہیں، جن میں اہم ہیں: 1987 میں "قوس قزح" کو مہاراشٹر اردو اکادمی سے نقد انعام۔2009 میں ''چالاک بجو کے'' کو بہار اردو اکادمی سے نقد انعام اور ایم پی اردو اکادمی سے بھی 15000 کا نقد انعام۔2013 ناول "چاند کنارے" کو بہار اردو اکادمی سے نقد انعام۔2023 میں "ابا جان" (اردو میں بچکانچوں کے پہلے مجموعے) کو اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ایوارڈ اور دس ہزار روپے کا نقد انعام۔2023 میں بزم غالب شولا پور مہاراشٹر کی جانب سے کرائے گئے کل ہند ڈرامہ نویسی کے مقابلے میں ڈرامے" کورونا عدالت میں" کو اول انعام کے طور پر پندرہ ہزار روپے نقد،ٹرافی اور سند سے نوازا گیا۔دسمبر 2023 میں رونق جمال کو اردو زبان و ادب کی نمایاں خدمات کے لیے "امراوتی یونیورسٹی" کی جانب سے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔رونق جمال کی شخصیت اور فن پر تحقیقی کام جاری ہے۔آپ کی کئی تخلیقات نصاب کا حصہ بن چکی ہیں۔ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی نہایت احسن طریقے سے ہمت افزائی کرتے ہیں۔ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت ان کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔

مجھے آپ سے کچھ ماہ پہلے ہی ملاقات کا موقع ملا تو آپ کی علم دوستی، منکسر المزاجی، شفقت اور ملنساری سے متاثر ہوئے بغیر میں نہیں رہ سکی۔عام بول چال میں بھی آپ کا انداز نپا تلا رہتا ہے اور شیریں گفتاری کوٹ کوٹ کر بھری رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ رونق جمال اپنے ادبی اثاثوں کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے بھی قارئین کے دلوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔آپ کی شخصیت پر مبارک صدیقی کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے:

☆☆☆

غزل

تیرے آستاں پہ نماز عشق جو ادا ہوئی سو ادا ہوئی
تیری راہ میں میری جان بھی جو فنا ہوئی سو فنا ہوئی

مجھے صبح شام یہی کام ہے، میرے لب پہ تیرا ہی نام ہے
تو جو کہہ رہا ہے اسے وفا جو وفا ہوئی سو وفا ہوئی

سر بزم تیرے لبوں پہ ہی یہ نگاہ میری ٹکی رہی
سبھی کہہ رہے ہیں اسے خطا، جو خطا ہوئی سو خطا ہوئی

تیرے عشق میں رہا در بدر سبھی کہہ رہے میرے حال پر
ہے تیرے جنوں کی یہی سزا جو سزا ہوئی سو سزا ہوئی

مجھے دیکھ کر تو جو ہنس پڑا تیری اس ہنسی پہ ہے جاں نثار
میری چاہتوں کی یہی جزا جو جزا ہوئی سو جزا ہوئی

تیرے ناز اٹھائیں ہیں کس قدر میرے حال سے ہے تو بے خبر
اے غزل یہ تیری جفا ہوئی جو جفا ہوئی سو جفا ہوئی

میں نے ایک غزل جو سنا دیا تو غزل کو سن کے کوئی غزل
خدا جانے کیوں وہ فدا ہوئی جو فدا ہوئی سو فدا ہوئی

اسی شہر حرف و بیان میں کوئی یاسؔر بے نوا بھی ہے
اسی بے نوا کی نوا غزل جو نوا ہوئی سو نوا ہوئی

☆☆☆

لیاقت علی خان یاسؔر جالنوی
(جالنہ، مہاراشٹر۔ موبائل: 9422724257)

''۱۸۵۷ اردو مآخذ کے آئینے میں'': ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد حامد آفاق قریشی
(لکھنؤ)

1857 کی گرمیوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کے ہندوستانی سپاہیوں کے اپنے آقاؤں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی وجہ سے جو واقعات رونما ہوئے ان کے بارے میں اردو و فارسی مآخذ میں اکثر و بیشتر ایسے حقائق مل جاتے ہیں کہ ان کی مدد سے واقعات کو صحیح طور پر جاننے اور پرکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے لہذا بغیر ان کی مدد کے اس زمانے کی ٹھیک ٹھیک سچی اور بھروسے کے لائق تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ اس نقطہ نظر سے ڈاکٹر درخشاں تاجور کی یہ کتاب 1857 کی جنگ آزادی پر اردو میں شائع کتابوں کا تنقیدی جائزہ'' کی اہمیت وافادیت بالکل واضح ہے۔ دراصل اس قسم کی دیگر کتب کی اشاعت کی اشد ضرورت ہے تاکہ 1857 سے ۱۸۵۹ کے واقعات کا ایک صحیح اور جامع مرقع مرتب کرنے میں آسانیاں فراہم ہوسکیں۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ و مابعد کے واقعات پر لکھی جانے والی فارسی و اردو کتابیں زیادہ تر ان لوگوں نے لکھیں جو یا تو برٹش سرکار کے پینشن یافتہ نوکر اور سرپرستی میں پلنے والے شخص تھے یا پھر وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی کتابیں اس وقت لکھی جبکہ ملک میں انگریزی راج کا دور دورہ تھا۔ اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کی ان کی کتابوں میں جہاں کہیں انگریزوں کا ذکر آتا ہے وہ ان کے شان میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور اکثر و بیشتر انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لینے والوں کا ایک مضحکہ خیز خاکہ ابھارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی کاوشوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے ایسا ضرورت کے تحت اور وقت کے تقاضوں کی وجہ سے کیا۔ ان سب کے باوجود ایسے ماخذ ایسی شخصیتوں اور واقعات کا بیان کرتے ہیں جو ہمیں کسی ماخذ میں دستیاب نہیں ہوتے۔ یہ تذکرے یا سیرت سے متعلق تفصیلات، واقعات سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے رجحانات، ادراکات، طور طریقے، حرکات وسکنات، چالیں، ذہنی اور جذباتی کیفیات، حربی ساز وسامان، رسد رسانی وقیادت کے بہترین مرقعے ہیں۔

معین الدین حسن خاں کی ''خدنگ غدر'' ۱۸۵۷ مابعد کے واقعات کی قاموس ہونے کا درجہ رکھتی ہے اور تمام ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات سے ہمیں روشناس کراتی ہے لہذا ڈاکٹر درخشاں تاجور نے بجا طور پر اپنی کتاب کا آغاز اسی سے کیا ہے معین الدین حسن خان دہلی میں ہونے والے واقعات کا عینی شاہد تھا، اس لیے بھی اس کتاب کی کافی اہمیت ہے۔ دہلی کے واقعات کے لیے اردو فارسی میں دیگر عینی شاہد بھی ہیں اس لیے محی الدین حسن خاں کی کتاب بشیر الدین احمد کی ''واقعات دارالحکومت دہلی'' کی طرح 1857 مابعد کے دہلی کے واقعات پر زیادہ اچھی واضح اور سلیقہ سے لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے بلکہ لیکن دیگر جگہوں کے بارے میں اس کی دی ہوئی معلومات اور اس میں حصہ لینے والے لوگوں کے تجزیے سے یہ کتاب مالا مال ہے اور اس کی اہمیت سے کسی بھی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی بھی دور کی تاریخ لکھنے کے لیے روزنامچوں کی اپنی ایک الگ حیثیت واہمیت ہے۔ روزنامچہ واقعے کے اردگرد ہی گھومتا ہے اور اس میں تازگی کی جو چاشنی ہوتی ہے وہ پھر ہم عصر خطوط میں ہی پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے دور کا جیتا جاتا مرقع ہوتا ہے۔ اس کتاب میں شامل روزنامچے ایسے ہی بے بہا قیمتی مآخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ لکھنے والا اگر محرر ہو تو واقعات کے ساتھ ساتھ ادبی لطف انگیزی تحفہ بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جیون لال محرر کا روزنامچہ 11 مئی سے 14 دسمبر کو 1857 کے واقعات پر مبنی ہے لیکن اس کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کو انگریزوں کے ایک جاسوس نے لکھا ہے اور اس کا مقصد ان تمام تر تفصیلات کی پرحاوی ہے جن کا جاننا انگریز آقاؤں کے لیے ضروری تھا اور ان کی روشنی میں وہ اپنی جنگی چالوں کو چل سکتے تھے اس کا تعلق محض دہلی کے واقعات ہیں۔ اسی طرح دوسرے عینی شاہد عبداللطیف کا روزنامچہ 11 مئی سے ۴ ستمبر 1857 کے حالات پر مشتمل ہے

اور دہلی واس کے اطراف کے بارے میں معلومات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ سابقہ تمام کتابوں کی برخلاف سیرت و کردار نگاری میں زیادہ بہتر تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ مختلف علاقوں سے آنے والے فوجی دستوں کی تفصیلات اس روزنامچے کا خاص حصہ ہے اور وہ ایسے علاقوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو دیگر مآخذ میں دستیاب نہیں ہے۔

ظہیر دہلوی کی خودنوشت سوانح حیات ''داستان غدر'' ظاہر ہے کہ اپنے عنوان کے مطابق تذکرہ اور سیرت نگاری پر زیادہ زور دیتی ہے لیکن اس کا خاص حصہ 1857 کے دہلی کے واقعات کی تفصیلات فراہم کرتا ہے۔ اس کے عینی واقعات کے علاوہ دوسروں سے واقعات کو سن کر ان کو لکھ دیا ہے اور ان کی تصدیق و چھان بین کا کام ہم پر چھوڑ دیا ہے۔ منظر کشی میں اس کو ان کو خاص ملکہ حاصل تھا اور یہ چیز 1857 کے معاملے میں ہمارے لیے زیادہ کارآمد ہے خاص طور پر میرٹھ کے فوجیوں کی آمد کی منظر کشی دیگر مآخذ کے مقابلے میں اس میں زیادہ تفصیل سے دستیاب ہے۔

غالب اور ان کی ادبی نگارشات کی اہمیت وقدر قیمت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ان کی فارسی تصنیف ''دستنبو'' بھی اس کتاب کی زینت بنی ہے۔ غالب 1857 کے بارے میں جتنا جانتے تھے اتنا تو نہ لکھ سکے لیکن جو کچھ لکھا وہ بہت ٹھیک اور صحیح معلومات پر مبنی ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کے عینی شاہد تھے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب کے ذریعے کچھ چھپے ہوئے گوشوں کو اجاگر کرنے کا کام بڑی چابک دستی اور کمال سے کیا ہے۔

واجہ حسن نظامی اپنے زمانے کے سیر حاصل اور پرنویس ادیب تھے۔ انہوں نے 1857 و مابعد کے واقعات پر بھی کی کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے دو کا انتخاب ڈاکٹر درخشاں تاجور نے تصویر کے دو رخ ابھارنے کے لیے کیا ہے۔ ایک ''غدر دہلی کے افسانے'' ان افراد کی آپ بیتی سناتی ہے جو چشم دید گواہ تھے اور ان کو بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان میں سے زیادہ تر کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ ان میں اکیس افسانے ہیں لیکن افسانہ افسانہ ہی ہوتا ہے اور خواجہ حسن نظامی کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ بعض افسانوں میں بہت رنگ آمیزی کی گئی ہے اور اثر پیدا کرنے کے لیے حالات اصلیت کے خلاف دوسرے طریقوں سے بیان ہوئے ہیں مگر نفس واقعہ کے سچے ہونے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تاریخ کے ماخذ ہونے کا شرف ان کی کاوشوں کو بس اسی حد تک حاصل ہوسکتا ہے جو انہوں نے خود طے کردی ہے اور تحقیق کار کو از سر نو اس معاملے میں مدد حاصل کر کے صحیح تصویر ابھارنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ یہی کام انہوں نے ''انگریزوں کے قصّے'' نام کی کتاب میں کیا ہے۔ اس بارے میں انگریزوں نے خود اتنا مواد اپنے پیچھے چھوڑا ہے کہ اگر صرف اس پر کام کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں تیار ہوسکتی ہیں لیکن یہ واضح ہے کہ جن کو وہ ''بدمعاش'' کہتے تھے فتح کے بعد وہ ان سے بھی بڑے ''بدمعاش'' نکلے۔

ولیم ایڈوارڈ کا روزنامچہ ایک جانی پہچانی کتاب ہے اور اس پر کچھ بھی لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ''کشف البغاوت'' جو گورکھپور کے واقعات پر مشتمل ہے اور ''نونگہ'' تو لکھنؤ اور اس کے اطراف کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ سید احمد علی شاہ کی ''کشف البغاوت'' میں مختصر مگر جامع حالات اعظم گڑھ، غازی پور اور خاص کر گورکھپور جس کے وہ عینی شاہد تھے بیان ہوئے ہیں۔ سابق ناظم محمد حسن کے ساتھ جو افراد شامل ہوئے ان کا بیان اس کی کتاب کا خاص حصہ ہے اور انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ بہرائچ، بھیٹی، مہسر اگھاٹ، شہباز گنج اور نکہا کی صورتحال کا مرقع بھی اس میں ہے۔ یہی حال پانڈے پار، پٹنہ، راجپور، نرہر پور، سوگولی، سلیم پور کے معاملے کا ہے جو اس میں درج ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر 1857 مابعد کے واقعات کے لیے یہ ایک انتہائی اہم کتاب ہے۔

میڈی لال کی ''نونگہ موسوم بہ محاربہ غدر'' لکھنو اور خاص طور پر اس کے اطراف کے واقعات پر ایک انتہائی اہم ماخذ ہے دیگر اردو فارسی ماخذ کی طرح یہ بھی انگریزوں کی تعریف اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کا خاکہ اڑانے پر سے پر ہے لیکن ان کی خامیوں اور کمیوں کو انتہائی موثر اور حقیقی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بغور پڑھنے کی چیز ہے۔

بہ حیثیت مجموعی ''1857 اردو مآخذ کے آئینے میں'' ایک اہم کتاب ہے اور ڈاکٹر درخشاں تاجور نے اسے لکھ کر تاریخی اور ادبی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا کام حسن وخوبی سے انجام دیا اس لیے اس کتاب کی پذیرائی کی جانی چاہیے۔

☆☆☆

عالم بالا سے میر تقی میرؔ کا ایک خط

(اُردو کے قدردانوں اور لکھنؤ والوں کے نام)

ڈاکٹر شاہدہ صدیقی

(لکھنؤ: 6394221988)

حاضرین، ناظرین، قارئین، سامعین!

عالم بالا سے میں میر تقی میرؔ، آپ سب سے مخاطب ہوں اہل ادب کی محفل میں جہاں مایۂ ناز ہستیاں موجود ہوں جو اُردو کی ٹمٹماتی لو کو برقرار رکھنے کی کوشش میں اپنے اپنے انداز سے نمایاں رول ادا کر رہی ہوں۔ اُن سے تخاطب کے لئے میری روح بے چین ہونے لگی ہے۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ جب قدردانِ اُردو۔ سخن دانِ ادب۔ اہل قلم۔ اہل علم۔ اہل ذوق کہیں یکجا ہوں تو ذکر کریں اُردو کا۔ پڑھیں اُردو ادب جانیں اُسکی اہمیت۔ پہچانیں خدّام سخن کو۔ فروغ دیں زبانِ شیریں کو۔ جس سے ہم جیسے خاک نشیں اک بار پھر جی اُٹھیں بوسیدہ اوراق میں سما جائیں لوگوں کے ذہنوں میں بکھر جائیں عوام کی زبان پر۔ خوش کن الفاظ میں۔ خوش گو انداز میں۔ خوش فکر احساس سے۔ خوش بیاں ہو کر اس لئے میں چاہتا ہوں اپنی رودادِ حیات سنانا۔ اپنے طریقہ سے۔ مگر.. شروع کہاں سے کروں۔ اور کہاں تمام کروں .. کیونکہ .. میرے والد بزرگوار میر علی نے تو ترکِ دنیا کر کے درویشی اختیار کر لی تھی۔ مگر مجھے ہمیشہ عشق کا درس دیا وہ چاہے مجازی عشق رہا ہو یا عشقِ حقیقی اور تلقین کی کہ "اے پسر عشق بُود از

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو : سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

یہی وجہ تھی کہ گھر کی فضا میں درویشی تھی اور روحانی کشف و کرامات اور میرے ذہن میں اشعار و عشق کی ملاوٹ۔

جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجئے : دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا۔

بس۔۔ یہ باتیں ایسی کام کر گئیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ سوز و گداز میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ غم روزگار کے ساتھ ساتھ ایک کافر ادا حسینہ کے تیر نظر کا شکار ہو کر غمِ جاناں سے بھی آشنا ہو گئے۔ نتیجہ۔۔ دونوں بوجھ غم کے سانچے میں ڈھل کر شاعری کی شکل میں نمایاں ہوئے۔

میں نے زندگی میں بہت سے اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ بہت سے نشیب و فراز سے گذرا ہوں فکر معاش کا شکار ہو کر کمسنی میں ہی تلاش معاش کی خاطر اکبر آباد (آگرہ) سے دل والوں کی دلّی کا رخ کیا اور امیر الامراء صمصام الدولہ تک رسائی حاصل کی جنہوں نے ہمارے لیے ایک روپئے روز کا وظیفہ مقرر کر دیا ہم نے اپنے بھائی کے رشتہ دار سراج الدین علی خاں قیام کیا شومئی قسمت ... کہ اس گھر کو آگ لگ گئی... میرے اپنے ہی بھائی کی تحریک پر خان آرزو نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا حتّٰی کہ وہ میرے در پر اتنا آزار ہو گئے کہ مجھے ان کا مکان چھوڑنا پڑا۔ خوبیٔ قسمت دیکھیے کہ ایک رئیس ریاست علی خاں نے مجھے اپنا مصاحب بنا لیا۔

اس طرح تنگ دستی سے گونہ نجات ملی۔ انہی کے ساتھ میں نے اجمیر کے قریب قصبہ سانبھر کی سیر کی۔ جب رعایت علی خاں اور راجا رنجیت سنگھ میں شکر رنجی ہو گئی تو میں نے دونوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی مگر واہ ری بھل منساہت... مجھے اس کا صلہ یہ ملا کہ نوکری بھی گئی اور دوستی بھی اس پر ستم یہ کہ میری جگہ میرے چھوٹے بھائی محمد رضی کو رکھ لیا گیا۔ مجبوراً میں نے نواب بہادر کے یہاں ملازمت کر لی۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ میں بنجارہ بنا گھومتا رہا۔ مگر میری بدقسمتی ہر جگہ میرا پیچھا کرتی رہی میرے نصیب کے دانے نہ جانے کس کس شہر میں اترے کس کس کے دسترخوان پر سجے۔ میں دہلی سے سر ہند پشکر سے اجمیر سکندرآباد سے بلند شہر ہوتا ہوا دلّی سے اکبرآباد (آگرہ) پھر شاہجہان آباد (دلّی) جا پہنچا۔

اس دشت کی سیاحی نے مجھے عشق میں تو ضرور ناکام کیا مگر میرے اشعار کو توانائی بخشی۔

میرے سفر میں جتنے پڑاؤ آئے وہاں مشاعروں کی کشش نے مجھے رکنے پر مجبور کیا کیونکہ میں جہاں جاتا تو "مجھ سے پہلے میرے اشعار وہاں تک پہنچی"

میں عشق کے جن جن ادوار سے گزرا ہوں انہیں میں نے اپنی مثنویوں میں پرو دیا اسلئے کہیں جوش عشق ہے تو کہیں اعجاز عشق کہیں خواب خیال میں جوان وعروس تو کہیں عشقِ دریا میں ڈوب کر ہے نیاوہ شعلہ عشق بھی کہیں مورنامہ شکل میں ہیں جنون پنہائے عشق میں۔

میری فطرت میں لاپرواہی بھی شامل تھی اور بے نیازانہ انداز بھی فاقہ کشی بھی تھی اور خودداری بھی اس لیے نہ رؤساء کے سامنے جھکا نہ انا کو مجروح ہونے دیا۔

جب فارغ البالی کی زندگی میسر آئی تو اس نے دلّی کی حالت کو ایسا ابتر کیا جس کی زد سے نہ امیر بچے نہ میر تقی میرؔ۔

مگر ہماری شاعری کے چرچہ ایسے پھیلے کہ لوگ ہمارا کلام بطور تحفہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے لگے۔

ادھر جب علم وفن دل والوں کی دلّی سے اجڑنے لگا تو حالات کے پیش نظر بے سروسامانی کے عالم میں نواب آصف الدولہ کا بلاوہ اودھ سے آ گیا بس..

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ خدا کی مرضی جان کر روانہ ہو گئے لکھنؤ کے جانب۔

بے سروسامانی کی حالت بیل گاڑی کا سفر ہفتوں، مہینوں کی راہ سے لکھنؤ پہنچے دستور کے مطابق ایک سرایہ میں اترے وہاں سنا کہ شہر میں مشاعرہ ہے۔

سن کر رہ نہ سکے۔ فوراً ایک غزل قلم بند کی اور اسی وضع قطع میں چل دیے جو دلّی والوں کا شیوہ تھی۔ کہ کھڑکی دار پگڑی مشروع کے گھیرے کا پاجامہ (جو ۵۰ گز کا تھا) جس کے پائنچے ہی گز بھر کے تھے پٹری دار رومال تہہ کر کے پستول کمر سے باندھا ڈیڑھ بالشت اونچی نوک والی انی دار جوتی۔ کمر میں ایک طرف سیف (تلوار) دوسری طرف کٹار۔

غرض جب داخلے محفل ہوئے تو شہر لکھنؤ میں نئی تراش نئے انداز کے ٹیڑھے بانکے جوان ہمیں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ کیونکہ یہاں پر ہماری پگڑی کی جگہ مسالے دار آڑھی ترچھی ٹوپی نے لے لی تھیں۔ مشروع کے پائجامے کے بجائے گل بدن کا ریشمی کسا ہوا گھٹنا جس کے ریشمی ازار بند میں کنجیوں کا گچھہ رقص کناں ہوتا۔

چست انگرکھا۔ کامدار جوتی۔ مہندی سے رچے ہاتھوں میں ریشمی رومال۔ کلّے میں خوشبودار پان کی گلوری۔ ہونٹوں پر لاکھا۔ سیدھی مانگ۔ یہاں کے خواص وامراء کی یہی تھی پہچان۔

ایسی متضاد پوشاک کو دیکھ کر نوجوانوں کا مسکرانہ فطری تھا۔ ایسے میں کسی نے فقرہ اچھال دیا کہاں سے تشریف آئی ہے ؟

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنوں : ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب : ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے چند روز بعد بارگاہ آصفی میں باریابی کا موقعہ ملا۔ پہلے ہم سالار جنگ کے یہاں گئے۔ ان کے ساتھ جب پہونچے تو نواب آصف الدولہ مرغوں کی لڑائی دیکھنے میں منہمک تھے۔ میرؔ نے مودبانہ سلام پیش کیا۔

نواب صاحب سراپا اخلاق۔ مجسّم تہذیب۔ ہمہ تن خلوص و محبت کچھ وضع قطع سے کچھ قیافہ سے فوراً پہچان گئے اور پوچھا۔ تم میر تقی میرؔ ہو۔

ہم نے تسلیم عرض کیا: نواب صاحب بغلگیر ہوئے اور اپنے ہمراہ نشست گاہ تک لے گئے۔ اپنا کلام سنایا ہم نے جی کھول کر داد دی۔

ہم سے بھی کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ ہمارے اشعار سن

کر بہت محظوظ ہوئے۔سالار جنگ نے دست بستہ عرض کی میرؔ صاحب حسب الحکم حاضر ہیں ان کے لئے مناسب حکم فرمایا جائے۔

نواب صاحب نے دوسو روپے ماہانہ کا فرمان جاری کر دیا۔

ایک دن نواب صاحب شکار کھیلنے بہرائچ جانے لگے تو ہمیں بھی اپنا ہم رکاب بنالیا۔ہم ان کے ہمراہ بہرائچ۔پیلی بھیت اور دامن کوہ تک جا پہنچے۔

اس دشت کی سیاحی نے میرے اشعار کو توانائی بخشی۔ان کی صحبت میں میں نے شکار نامہ موزوں کیا۔جب کوہ شمال کے دامن تک گئے تو دوسرا شکار نامہ ان کے حضور پیش کیا۔

میں نے لکھنؤ کے چھوٹے بڑے تین نوابی دور دیکھے۔

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں آئے

نواب وزیر علی خاں کا مختصر دور دیکھا

نواب سعادت علی خاں کے عہد کا بڑا حصہ دیکھا

یوں تو میں نے اسی لکھنؤ میں زندگی کے تیس برس (۳۰) گزارے... مگر... سسک سسک کر۔تڑپ تڑپ کر۔دلّی کی یاد میری سانسوں میں بسی رہی۔

اور قلعہ معلّٰی۔شاہی مسجد اور اس کے اردگرد کی دوستوں کی صحبتیں ذہن سے محو نہ ہوسکیں۔اور جہانگیر اور شاہ جہاں کی دلّی میری آنکھوں میں ہمیشہ بسی رہی

سنا ہے دار فانی میں لوگوں نے میرے زندگی کے ہر پہلو پر پھاوڑے بھی چلائے اور طنز کے تیر بھی۔

میری مذہبی فکر کو انسانیت کا جامہ پہنا کر سراہا بھی۔تراشا بھی۔ میرے گذرے ہوئے ہر لمحہ کی کھوج بین بھی کی اور اشعار کو ازبر بھی کیا۔

کاش میری زندگی پر مقالہ نگاری کرنے والے اُس دور سے گزرے ہوتے جس میں میں نے سرد آہیں بھی بھریں اور سرد مہری بھی سہی۔

میری محرومیوں سے میری ناکامیوں سے اگر کچھ حاصل کر لیا ہوتا تو اردو کا مستقبل اتنا تاریک نہ ہوتا اور نہ ہماری تربت ہی غائب ہوتی جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔

☆☆☆

غزل

میری متاع کل پہ تمہاری نگاہ ہے
اب شہر یار تم سے تو مشکل نباہ ہے

یہ وقت کس کا کب ہوا ہے روئے ارض پر
ہر لمحہ آدمی کے لئے انتباہ ہے

وہ کل گلا دبائے گا ہم کو ہے یہ یقین
جو دیکھنے میں آج بڑا خیر خواہ ہے

وہ تخت عرش پاک سے بےحد قریب ہے
مظلوم کی زباں پہ جو آہ و کراہ ہے

کچھ احتیاط لازمی ہے قول و فعل میں
اے شیخ تیرے فعل پہ سب کی نگاہ ہے

سادھو تو اپنی غیرت انسانی کھو چکے
اب مولوی بھی سب سے بڑا کج کلاہ ہے

بےنام تاب درد کے حامل ہو یا نہیں
تم جس پہ چل رہے ہو وہ پر خار راہ ہے

☆☆☆

بےنام گیلانی

خواجہ میر دردؔ ایک سچے صوفی شاعر

محمد وارث

(ریسرچ اسکالر رانچی، یونیورسٹی رانچی، موبائیل:7488316489)

خواجہ میر درد تصوف کے ایک صوفی شاعر اور تصوفانہ شاعری کے امام کہے جاتے ہیں گویا کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ میر درد ایک سچے صوفی اور مذہبی انسان تھے۔ان کے تصوف رسمی نہ تھا بلکہ ان کی تمام ہستی میں رچ بس گیا تھا ان کی شاعری تصوف کی تابع ہے۔تصوف شاعری کا تابع نہیں ہے اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی صوفی ہوتے۔

خواجہ میر درد کا شمار اپنے دور کے ممتاز صوفیوں اور بزرگوں میں ہوتا ہے۔خواجہ میر درد کی شاعری اور زندگی میں کامل ہم آہنگی ہے تصوف نے ہی ان کی شاعری میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا کی۔درد نے صوفیانہ تجربات کو تخلیقی اظہار کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے غزل کی مخصوص روایت بنا دیا ان کے منضبط فکری نظام نے ان کی شاعری کو ایک وحدت عطا کی۔

خواجہ میر درد زندگی بھر تصوف اور اس کے مسائل پر غور وفکر کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ ان کے صوفیانہ شاعری میں مضامین کا تنوع ہے۔ان کی دنیا تصوف اور درویشی تھی اس لیے وہ تصوف کے بے شمار مسائل پر غور وفکر کرتے رہے۔انہوں نے تصوف کے بے شمار مسائل ومعاملات کو تجربات اور واردات وکیفیات کا روپ دیا ہے اور غور کرنے پر ان کی شاعری میں مسائل تصوف کی تہیں کھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

انہوں نے صوفیانہ وجدان اور راہ سلوک کے تجربات عام انسانی تجربات ہم رنگ بنا کر اردو شاعری میں پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنے حال وقال کو شاعری میں ملا کر ایک کر دیا۔درد کے نزدیک شاعری واردات قلبی اور تجربات باطنی کا اظہار ہے۔

درد نے اپنی شاعری میں صوفیانہ تصورات اور اصطلاحات کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔مثلاً حقیقت ومجاز،عشق وعقل،قلب ونظر،ذکر جلی وخفی،جبر واختیار،خلوت درانجمن،سفر درطن،فنافی اللہ،فنا وبقاء بے ثباتی وبے اعتباری،وحدت وکثرت،عنیت،توکل وفقر وغیرہ۔درد کی شاعری صوفیانہ تصورات کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ درد اور تصوف ایک ہو جاتے ہیں۔یعنی لازم وملزوم ہو جاتے ہیں۔ان کے یہاں موت کے تصور کو صوفیانہ سطح پر حل کیا گیا ہے۔

خواجہ میر درد کی شاعری میں صوفیانہ اشعار کو ملاحظہ فرمائیں:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سماسکے

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا ، واں بھی شہود تیرا

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
متفق آپس میں اہل شہود
درد آنکھیں دیکھ باہم ایک ہیں

مذکورہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا کہ خواجہ میر درد کہنا چاہتے ہیں کہ فقیر کے اشعار باوجود رتبۂ شاعر کی روایت کے پیشہ شاعری اور اندیشہ ظاہری کے نتائج نہیں ۔ بندے نے کبھی شعر بدون آمد کے موضوع نہیں کیا اور بتکلف کبھی سحر شعر وسخن میں مستغرق نہیں ہوا کبھی کسی کی فرمائش اور آزمائش سے متاثر ہوکر شعر نہیں کہا۔ درد کی غزلیں متصوفانہ خیالات، معاملہ بندی، نزاکت، حسن خیال، شوخی اور لطافت سے معمور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نور یا نار کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اگر انسان راہ حق کا راہی ہوجائے تو اس کی افضلیت فرشتوں سے بڑھ جاتی ہے۔

خواجہ میر درد کے متعلق شمس العلماء سید امداد امام اثر لکھتے ہیں:

"خواجہ میر درد کے غزل سرائی نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ سوز وگداز میں ان کے جواب میں میر تھا یا آپ اپنا جواب تھے۔ واردات قلبیہ کے مضامیں ایسے باندھتے تھے کہ سودا ان تک نہ پہنچتے تھے ۔ ہر چند خواجہ کا دیوان مختصر ہے مگر قریب قریب انتخاب کا حکم رکھتا ہے"۔

(دیوان درد: مرتب فاروق ارگلی، صفحہ 5)

مذکورہ بالا پیراگراف سے واضح ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد کی شاعری کی بساط کس درجہ اعلی وارفع تھا۔ خواجہ میر درد کی شاعری میں کسی بھی شاعری کی کوئی تقلید نہیں تھی بلکہ خواجہ میر درد کے یہاں تصوف کی اس قدر بالادستی تھی کہ اس زمانے کے اچھے اچھے شعراء ان کی پیروی کرتے تھے۔ خواجہ میر درد ایک بلند پایہ صوفی شاعر اور بہتر غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے دلوں میں آج بھی زندہ وتابندہ ہے۔

نکات الشعراء میں میر نے آپ کا تذکرہ بڑے ہی احترام کے ساتھ اور محبت بھرے الفاظ میں کیا ہے۔

"خواجہ میر درد اور التخلص بدرد جوش بہار گلستان سخن، عندلیب خوش خوان چمن این فن، زبان گفتگو پیش گرہ ، کشائے زلف شان مدعا، شاعر زور آورد درریختہ ، خلیق ، متواضع، آشنائے دوست، شعر فارسی ہم گوید، اما بیشتر رباعی، گرمی بازار ووسعت مشرب اوست"۔

(نکات الشعراء، مصنف خواجہ میر تقی میر، مرتب مولوی عبدالحق، مطبوعہ 1925 صفحہ 5)

مذکورہ عبارت سے صاف واضح ہے کہ خواجہ میر درد کا مقام میر تقی میر کے ہاں کیسا تھا اور اور کس قدر ان کی شاعری ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میر نے ان کو ریختہ کا زور آور شاعروں میں شمار کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد کی شاعری میں تصوف کا جو رنگ وآہنگ دیکھنے کو ملتا ہے وہ کسی دوسرے شعراء کے ہاں نہیں ملتا ہے۔ خواجہ میر درد کی شاعری میں سوز اور گداز کی جو روانگی ہے وہ کسی دیگر صوفی شاعروں کے ہاں عنقا نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

(1) (دیوان درد: مرتب فاروق ارگلی)

(2) (نکات الشعراء: مصنف خواجہ میر تقی میر، مرتب مولوی عبدالحق، مطبوعہ 1925)

(3) اردو شاعری میں تصوف میر، سودا اور درد کے عہد میں: مصنف، ڈاکٹر نفیس اقبال، مطبوعہ روشان پرنٹرس دہلی)

(4) درد کی شاعری کا صوفیانہ لب ولہجہ: از ڈاکٹر سید عبداللہ، مرتبین، ثابق صدیقی، انیس احمد، مطبوعہ، دی اے ایس پبلیکیشنز)

مولانا تھانوی (مولانا اشرف علی تھانوی) کے مواعظ کی شگفتگی، ان کا انتہائی واضح اور دل نشین اسلوب، اور جگہ جگہ اشعار کی برجستگی مجھے بہت اچھی لگی۔ میرا خیال ہے کہ میں نثر میں وضاحت اور استدلال پر اس قدر زور دیتا ہوں، تو اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ میں بچپن میں مولانا تھانوی کے اسلوب سے اثر پذیر ہوا ہوں۔"

(شمس الرحمن فاروقی)

غزل

درختوں کی جڑوں کو کاٹ کر ہم گھر بنائے تھے
پرندے اس لیے مڑ کر دوبارہ گھر نہ آئے تھے

گزاری عمر ساری جس نے ہم سے دشمنی کرتے
ہمارا ظرف تو دیکھو اسے ہم گھر بلائے تھے

تمہیں کچھ یاد ہو نہ ہو مجھے سب یاد ہے جاناں
وہ بچوں کی طرح مجھ کو کبھی جو تم رلائے تھے

عداوت میں سرفہرست اس کو ہم نے خود دیکھا
برے وقتوں میں اپنا جان کر جس کو بچائے تھے

میرے دشمن سر بازار کہتے پھر رہے ہیں یہ
مری عظمت بڑھانے میں پسینے وہ گرائے تھے

ہم اپنے منہ سے کیا بولیں، تم اپنے دل سے یہ پوچھو
ضرورت تم کو لائی تھی یا ہم خود چل کے آئے تھے

خدائی کا نشہ جس سر پھرے پر آج ہے طاری
انہی ہاتھوں سے ہم نے مدتوں لقمے کھلائے تھے

☆☆☆

شہاب الدین شفیق
(سنڈوارہ، سیتامڑھی، بہار، موبائل:7979033149)

غزل

سوئے ہوئے دلوں کو جگاتے رہیں گے ہم
خاموشیوں میں شور مچاتے رہیں گے ہم

کیا ہے کسی کے دل میں نہیں ہے پتہ مگر
رشتہ محبتوں کا نبھاتے رہیں گے ہم

اپنے لئے بھی سوچنا اب چاہیے ہمیں
کب تک کسی کے کام میں اتے رہیں گے ہم

وعدہ کیا ہے ہم نے یہی زندگی سے آج
اک دوسرے کا ساتھ نبھاتے رہیں گے ہم

تاریکیاں جہاں کی مٹانے کے واسطے
دے کر لہو چراغ جلاتے رہیں گے ہم

یہ جانتے ہوئے بھی کہ محفل ہے غیر کی
اصغرؔ سبھی سے ہاتھ ملاتے رہیں گے ہم

☆☆☆

اصغر شمیم
(کولکاتا، مغربی بنگال۔ موبائل:9836224948)

نظم

کینسر ہے مُجھے

کینسر سے نبرد آزما ہُوں نیازؔ
دَم بہ دَم موت سے لڑ رہا ہُوں نیازؔ
کینسر سے نبرد آزما ہُوں نیازؔ
کینسر سے گلے کے مَیں دو چار ہُوں
کِتنا مجبور ہُوں کِتنا لاچار ہُوں
موت سے زِندگی کا طلب گار ہُوں
اپنے ہی سائے پر گِرتی دیوار ہُوں
جاگتی آنکھوں سے سو رہا ہُوں نیازؔ
کینسر سے نبرد آزما ہُوں نیازؔ
اُف ! یہ موذی مرض جاں کا دُشمن ہُوا
مَیں سراپا خزاں دیدہ گُلشن ہُوا
پچھلے سال اِک بڑا آپریشن ہُوا
گرد آلود جیون کا درپن ہُوا
خود میں خود کو خود ہی ڈُھونڈتا ہُوں نیازؔ
کینسر سے نبرد آزما ہُوں نیازؔ
جب بھی خاموش تنہائی کو پاتا ہُوں
خود کلامی میں مصروف ہو جاتا ہُوں
دِل بَہلتا نہیں پھِر بھی بَہلاتا ہُوں
اپنے ہی آپ سے مَیں لِپٹ جاتا ہُوں
غم غلط اِس طرح کر رہا ہُوں نیازؔ
کینسر سے نبرد آزما ہُوں نیازؔ
ذہن و دِل پر مرض کا دباؤ لِئے
آنکھوں میں آنسوؤں کا جماؤ لِئے
بحرِ اُمید میں خستہ ناؤ لِئے
جلتا بُجھتا سُلگتا الاؤ لِئے
روشنی کی ڈگر دیکھتا ہُوں نیازؔ
کینسر سے نبرد آزما ہُوں نیازؔ
خرچے بڑھتے ہُوئے جیب اُلٹنے لگے
روز و شب اب تگ و دو میں کٹنے لگے
ذہن و دِل فِکرِ فردا سے اٹنے لگے
پیاس بڑھنے لگی اوٹ گھٹنے لگے
جینے کی ضِد پہ پھِر بھی اَڑا ہُوں نیازؔ
کینسر سے نبرد آزما ہُوں نیازؔ
زِندہ لاش اپنی خود ہی اُٹھائے ہُوئے
آنکھوں میں کل کے سپنے سجائے ہُوئے
سینے میں درد و غم ، دُکھ چھپائے ہُوئے
دِل میں جینے کی حسرت بسائے ہُوئے
زِندگی کی دُعا کر رہا ہُوں نیازؔ
کینسر سے نبرد آزما ہُوں نیازؔ
موت ہے زِندگی جانتا ہُوں نیازؔ
مَیں ڈرا تھا نہ مَیں ڈر رہا ہُوں نیازؔ
رو برو کینسر کے ڈٹا ہُوں نیازؔ

☆☆☆

نیازؔ جیراجپوری
(اعظم گڑھ، یُو۔پی۔موبائل: 9129516996)

داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے ہیں

رینو بہل

چنڈی گڑھ۔ موبائل: 9781557700

اُس روز اچانک تقریباً چالیس سال بعد اُسے سامنے دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ میں شمشان گھاٹ سے روی کی آخری رسومات سے فارغ ہو کر نکل ہی رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے مجھے نام لے کر پکارا۔ پلٹ کر دیکھا تو آدیت کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ایک مدت بعد اچانک اُسے سامنے دیکھ کر میرا اُداس چہرہ بھی کِھل اُٹھا۔ دراصل روی، آدیت، پلوی اور میرا بچپن اور جوانی ایک ہی محلے میں ایک ساتھ گزرے ہیں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی ہم کئی برسوں بعد مِل رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس کے لیے وقت تھم سا گیا ہے۔ بڑھتی عمر اس کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ آگے کے دو دانت ضرور غائب ہو چکے تھے اور بالوں کا رنگ خضاب کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی سیاہ دِکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اُمڑی چمک کا راز میں بخوبی جانتی تھی۔ بہت سے سوال اُس کی آنکھوں میں مچل رہے تھے۔ اس کی کیفیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ماضی کے سائے اب بھی اُس کے وجود سے لپٹے ہوئے ہیں۔ نہ ہی وہ جگہ بات چیت کے لیے مناسب تھی اور نہ ہی ماحول۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے کے بعد زندگی کے موجودہ حالات پر سرسری باتیں ہوئیں۔ ایک دوسرے کو اپنا فون نمبر دے کر رابطے میں رہنے کا وعدہ کر کے ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

وقت کی گرد میں چہرے دھندھلا ضرور جاتے ہیں، مگر وہ اپنی شناخت اور اہمیت برقرار رکھتے ہیں۔ آدیت کا وجود بھی وقت کی آندھی میں کہیں کھو گیا تھا اور اچانک سامنے دیکھ گزرا ہوا وقت لمحہ لمحہ زندہ ہو گیا۔ آج پلٹ کر اُس وقت کے بارے میں سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم دونوں میں بہت سی باتیں یکساں تھیں۔ ہم دونوں جذباتی تھے، دِل کی گہرائیوں سے محبت کرنے والے، اندھا اعتماد کرنے والے اور جاں نثار کرنے کو بے تاب۔ ہم دونوں نے انہیں کمزوریوں کی وجہ سے چوٹ بھی کھائی، صدمہ بھی سہا اور وہ بھی ایک ہی شخص کے ہاتھوں۔ وقت کے ساتھ گہرے زخم بھی بھر جاتے ہیں مگر اُن کے نشان تاعمر سبق بن کر یادرہ جاتے ہیں۔

مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ میری اور پلّوی کی دوستی کب اور کیسے ہوئی۔ شاید جب سے ہوش سنبھالا تب سے ہی ہم ایک دوسرے کو جانتی تھیں۔ ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے ایک ساتھ کھیلتے کودتے، لڑتے جھگڑتے بچپن کا وہ حسین دور ایک ساتھ گزارا۔ اُس وقت ہر چیز خوبصورت لگتی تھی۔ ہر رنگ اچھا لگتا تھا۔ موج تھی، مستی تھی، کوئی فکر نہ کوئی فاقہ۔ تتلیوں کی مانند اُڑتی پھرتی، پرندوں کی طرح چہکتی، بے بات ہی کھلکھلا کر ہنستی رہتی تھیں۔ گہری دوستی کے باوجود ہم دونوں کے مزاج اور دلچسپیوں میں فرق تھا۔ وہ سائنس کی اور میں آرٹس کی طالب علم تھی۔ وہ ہمیشہ اوّل درجے میں پاس ہوتی۔ اور میں کھینچ تان کر ہی اوّل درجے کی دہلیز تک پہنچتی۔ سائنس اور ریاضی اُس کے محبوب موضوع تھے اور مجھے ان دونوں کے بارے سوچ کر کوفت ہوتی مجھے ادب، موسیقی، اور مصوری میں دلچسپی تھی۔ وہ دماغ سے سوچتی تھی اور میں دل سے۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ہماری آنکھوں میں رنگین خواب تیرنے لگے تھے۔ سج سنور کر محلّے سے جب ایک ساتھ نکلتی تو بن دیکھے اندازہ ہو جاتا کہ کئی نگاہیں اس وقت ہمارا تعاقب کر رہی ہیں۔ ہمارے سراپے کا جائزہ لے رہی ہیں اور یقیناً اُن کی آنکھوں کی چمک اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ہمارا سراپا قابلِ ستائش ہے۔ چترنجن کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں اور میری چال میں مستی نظر آنے لگتی۔ یہی حال پلوی کا آدیت کو دیکھ کر ہوتا۔ آدیت اس کے بھائی کا دوست تھا۔ گھر میں آنا جانا تھا۔ کب اُن کی آنکھیں چار ہوئیں۔ کب انھوں نے اک دوسرے کو دل دے دیا، اس کا پتا ہی نہیں چلا۔ ہم دونوں میں کسی بات کا پردہ نہیں تھا بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا

کہ اک دوسرے کو بات بتائے بنا ہمیں کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا تھا۔ میں اور چترنجن ابھی نظروں کے کھیل میں ہی اٹکے ہوئے تھے اور اُن دونوں کی پیار کی پینگیں بڑھنے لگی چوری چھپے ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ اکثر میں ان دونوں کے ساتھ ہی ہوتی کیونکہ اکیلے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میری ان آنکھوں نے ان دونوں کے نرم اور نازک جذبات کو پروان چڑھتے دیکھا ہے۔ ان کی آنکھوں میں مچلتے تیرتے خواب، ان کی اٹکھیلیاں، ان کے ہاتھوں کی شرارتیں دیکھی ہیں۔ ہنسی مذاق میں اگر آدیت کبھی میری تعریف کر دیتا تو وہ خفا ہو جاتی۔ اس کا روٹھنا آدیت کا منانا بھی مجھے اچھا لگتا۔ کباب میں ہڈی بننا مجھے بھی پسند نہیں تھا مگر دوستی کی خاطر یہ بھی برداشت کر لیتی۔ مجھے ساتھ رکھنا اُن کی مجبوری تھی۔

دیوانگی میں عقل کہاں کام کرتی ہے۔ ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہونے کی اُن کی خواہش نے انھیں اتنا بے قوف بنا دیا کہ اب اس کو سوچ کر میرا وجود لرز اٹھتا ہے بلے شاہ نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ:

جتھے عشق نے چاہتی پائی ہے
اوتھے عقل نے ہوش گوائی ہے

بارہویں کے امتحانوں کی تیاری بڑے زور شور سے چل رہی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ رات کو دیر تک پڑھنے کی وجہ سے پلوی نے اپنا بستر نیچی والی منزل پر بنے ڈرائنگ روم میں لگانا شروع کر دیا تھا۔ رات کو جب سب اپنے اپنے بستر میں گھس جاتے تو وہ آدھی رات تک پڑھنے کے بعد چپکے سے پیچھے والے دروازے کی کنڈی کھول دیتی اور طے شدہ وقت پر آدیت خاموشی سے اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس کی رضائی میں گھس جاتا۔ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں سما جاتے۔ لبوں سے لب ملتے۔ ایک دوسرے کے لمس سے سرشار ہوتے ایک عجیب سی خماری کا احساس ہوتا مگر پھر بھی حدوں کو انھوں نے عبور نہیں کیا۔ پاکیزگی کا دامن پامال نہیں کیا۔ یہ سلسلہ شاید مزید چلتا اگر ایک روز اس کے بڑے بھائی کو رات کے سنّاٹے میں دروازہ کھلنے کی آہٹ سنائی نہ دی ہوتی۔ وہ اٹھ کر نیچے آئے، بتیاں جلا کر ہر طرف دیکھا۔ آدیت سانس روکے اندھیرے میں دروازے کے پیچھے چھپا رہا۔ پلوی کے کمرے میں آ کر بتی جلائی دیکھا کہ وہ رضائی میں سو رہی ہے تو خاموشی سے بتّی بجھا کر چلے گئے۔ اس رات وہ بال بال بچے تھے اور تبھی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دوبارہ اِس طرح کا جوکھم نہیں اٹھائیں گے۔

بارہویں کے بعد اس نے یونیورسٹی میں بی ایس سی میں داخلہ لے لیا اور میں نے کالج میں۔ فرصت کا وقت حسبِ معمول ہم ایک ساتھ ہی گزارتیں۔ البتہ ان دونوں کے ملنے کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی۔ پلوی اسے پڑھائی کے بوجھ کا نام دے رہی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ یونیورسٹی میں سال گزارنے کے بعد ہی اسے ادیت کچھ کم تر لگنے لگا۔ اس کے نئے دوست اس کے لیے زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔

آدیت ہم سے دو سال آگے تھا۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اُسے سرکاری ملازمت مل گئی۔ وہ خوش تھا کہ اب وہ صاحب روزگار ہو گیا ہے اور اب وہ اپنے دونوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ سکتا ہے مگر پلوی کے تیور مجھے کچھ اور ہی بتا رہے تھے۔ وہ اسے نظر انداز کرنے لگی تھی جس کی تکلیف آدیت کے چہرے پر صاف نظر آتی تھی۔ کسی کی بے رخی اور سرد مہری کتنی اذیت ناک ہوتی ہے اس کا اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔ ادیت کے اس درد کو میں محسوس کر سکتی تھی کیونکہ چترنجن اور میری پریم کہانی محبت کی پہلی سیڑھی پر ہی دم توڑ گئی۔ ابھی تو جینے مرنے کے وعدے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اُس کا فوج میں انتخاب ہو گیا۔ اور انتخاب ہوتے ہی اس کی نظریں بھی بدل گئیں۔ انسان پل میں تولہ پل میں ماشا کیسے ہوتے ہیں یہ بھی دیکھ لیا۔ ایک طرف تو پلوی میرے زخموں پر مرحم رکھتی، مجھے تسلّی دیتی رہی اور دوسری طرف وہ خود ہی بے مروّتی سے آدیت کو اذیت دے رہی تھی۔ جب اس کی دال پلوی کے آگے نہ گل سکی تو وہ روتا گڑگڑاتا میرے پاس آیا کہ میں اس کی سفارش پلوی سے کروں۔ اب بھلا محبت میں بھی سفارش چلتی ہے؟ یہ تو دِل کے سودے ہیں۔ محبت کسی سے زبردستی تو نہیں کی جا سکتی؟ اگر کر سکتے تو میں اپنا دل ٹوٹنے سے نہ بچا لیتی؟

پلوی ذہین تھی، محنتی تھی۔ اس کے خواب بھی بڑے تھے۔ اُس کے ارادے بلند تھے۔ وہ کامیابی کی جس بلندی کی طرف گامزن تھی، اس راستے میں آدیت کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا مجھے۔ زخمی پرندے کی طرح وہ پھڑ پھڑاتا رہا۔ اس سے ملنے کے راستے تلاشتا رہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جسے اُسے دیکھے بنا قرار نہ آتا تھا وہ اچانک کیسے بدل

گئی۔ جس نے ساتھ جینے مرنے کے وعدے کئے تھے وہ اچانک راستہ کیسے بدل سکتی ہے؟ دل میں بسنے والا بے وجہ ہی دل سے کیسے اتر گیا؟ اب تک میں سمجھ چکی تھی کہ پلوی کی نظروں میں آدیت ایک معمولی سرکاری ملازم تھا اور وہ اپنے سے کم پڑھے لکھے کم حیثیت والے شخص کے ساتھ پوری زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وقت نے اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جن لوگوں کے مقصد بڑے ہوتے ہیں، جن کے خواب بلندیوں کو چھونے کے ہوتے ہیں وہ راستے کی ہر رکاوٹ کو روندتے کچلتے منزل تک پہنچنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ آدیت اس کے راستے کی رکاوٹ تھی جسے اس نے بنا کچھ کہے خاموشی سے اپنے قدم پیچھے کھینچ کر ہٹا دیا۔ اس رشتے کے ٹوٹنے کا سارا ملبہ اس نے اپنے بھائیوں کے سر ڈال دیا۔ اپنے ٹوٹے دل اور خوابوں کی کرچیاں سمیٹنے میں نہ جانے آدیت نے کتنی راتیں، کتنے مہینے، کتنے سال لگا دیے۔ کانٹوں کی چبھن کا احساس اس کے چہرے پر لکھا تھا جسے دیکھ کر میرا دل پسیج اٹھتا۔ پلوی کو اب آدیت کا ذکر سننا بھی گوارا نہ تھا۔ وہ صرف آگے دیکھنا چاہتی تھی پیچھے پلٹ کر دیکھنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔

آدیت نے اپنا تبادلہ کہیں دور دراز علاقے میں کروالیا۔ پلوی نے راحت کی سانس لی۔ زندگی کی اس رفتار میں سب اپنی اپنی منزلوں کی تلاش میں جدوجہد کرتے رہے۔ میں نے تعلیم مکمل کر کے ملازمت شروع کر لی اور پلوی نے یونیورسٹی میں ہی فزکس میں پی ایچ۔ ڈی شروع کر دی۔ اس کا زیادہ تر وقت کتابوں اور میرے ساتھ ہی گزرتا۔ بھائیوں کی شادی ہو جانے کی وجہ سے اس کے گھر کا ماحول بدل گیا تھا۔ جب اسے اپنے گھر میں پڑھائی کا ماحول نہ ملتا تو وہ ہمارے یہاں آجاتی۔ ہماری غیر موجودگی میں بھی وہ ہمارے کمرے میں پڑھتی رہتی۔ میرے والدین اس کی پڑھائی کی ایسی لگن سے بے حد متاثر تھے۔ میری ماں وقفے وقفے پر جا کر کبھی چائے کبھی ناشتہ بنا کر اُسے دے آتی۔ میری دونوں چھوٹی بہنیں ہر دم اُس کے ہر کام کے لئے بے قرار رہتی۔ وہ ان کے لئے رول ماڈل تھی۔ جب کبھی بھی ریسرچ کے سلسلے میں پلوی کو شہر سے باہر جانا ہوتا تو میں دفتر سے چھٹی لے کر اس کے ساتھ چلی جاتی۔ میرے والدین نے کبھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری تین نہیں چار بیٹیاں ہیں۔ یہ ہی پیار اور خلوص اس کے گھر والوں کے دلوں میں ہم سب کے لئے بھی تھا۔

میرے گھر میں میرے لئے مناسب رشتے کی تلاش زور شور سے چل رہی تھی۔ آئے دن نمائش کا سلسلہ نکل آتا۔ کبھی میں کسی کو پسند نہ آتی تو کبھی کوئی مجھے پسند نہ آتا۔ جانے انجانے میں اپنے ہونے والے شوہر میں شاید میں چترنجن کو تلاش کر رہی تھی۔ پہلی محبت لہو بن کر تاعمر شریانوں میں مچلتی رہتی ہے۔

ایک روز میرے ساتھ کام کرنے والے نوین نے جس کے ساتھ میں کافی بے تکلف تھی، دفتر میں ہی سب کے سامنے مجھے سے شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھے سے جانتے تھے، ہماری دلچسپیاں یکساں تھیں۔ کتابوں، فلموں، شاعری پر ہماری اکثر گفتگوں ہوتی رہتی۔ میں اسے اپنا اچھا دوست سمجھتی تھی، مگر اس طرح وہ شادی کا سب کے سامنے اظہار کر دے گا کبھی سوچا نہ تھا۔ اس کی بات سن کر پہلے تو میں سٹپٹا گئی۔ پھر شرم سے نظریں جھک گئیں۔ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ میرے اُٹھتے ہی کچھ پل پہلے جو خاموشی چھا گئی تھی وہ قہقہوں سے گونج اٹھی۔ اُس دن دفتر میں سب کی زباں پر یہی ایک بات رہی۔

اُسی شام نوین اپنے والدین کو لے کر ہمارے گھر پہنچ گیا اور اس کی والدہ نے باقاعدہ ضد کر کے رشتہ پکا کروالیا۔ ایک دو مرتبہ وہ پہلے ہمارے گھر آچکا تھا سب اس سے اچھے سے واقف تھے۔ ماں پاپا نے میری مرضی پوچھی تو میں نے حامی بھر دی۔ پلوی اس رشتے سے زیادہ خوش نہیں تھی۔

مجھے وہ بار بار کہتی رہی، ''تم نے ہاں کرنے میں جلدی کر دی۔''

''نوین تمہیں پسند نہیں؟ کیا کمی نظر آئی تمہیں؟'' ''وہ ایک اچھا لڑکا ہے مگر تم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہو۔'' جو بات وہ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی، وہ میں بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اب تک میں جان چکی تھی کہ وہ نام ونمود کی پرستار ہے۔ احساسِ برتری کا اضافہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ہو رہا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے ملازمین کو وہ کم تر سمجھتی ہے۔ خیر، دنیا کے ساتھ اس کا رویہ کیسا بھی ہو، میرے ساتھ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

ڈاکٹریٹ مکمل ہوتے ہی اسے یونیورسٹی میں ہی پروفیسر کی ملازمت مل گئی۔ میری اور نوین کی شادی کے دو ماہ بعد ہی یونیورسٹی کے

ایک ذہین اور قابل پروفیسر کا اس کے لئے رشتہ آ گیا جو بڑی خوش اخلاقی سے قبول کر لیا گیا۔ ڈاکٹر دت خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش مزاج انسان تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں اُس نے سب کا دل جیت لیا۔

شادی کے بعد زندگیوں میں تبدیلی آنا لازمی تھا جس کے بارے میں ہم دونوں شادی سے پہلے بات کر چکی تھیں۔ بے شک ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہو گیا تھا مگر رابطے برقرار تھے۔ آنکھوں سے دور تھے مگر دلوں میں دوریاں نہیں تھیں۔

پھر دھیرے دھیرے مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کی طرف سے رشتہ میں گرماہٹ کم ہونے لگی ہے۔ اب اس سے مل کر پہلے والی محبت، خوشی، اپنائیت محسوس نہیں ہوتی۔ دو تین مرتبہ میں نے اس کا گلہ بھی کیا۔ یہ بھی پوچھا کہ ڈاکٹر دت سے رشتوں میں کشیدگی تو نہیں؟ مگر اس نے ہر بار ایک ہی جواب دیا کہ ڈاکٹر دت اس کا پورا خیال رکھتے ہیں بس زندگی میں مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ کام کا بہت بوجھ ہے۔

سال بعد ہی اس نے بیٹی کو جنم دیا اور تیسرے سال میں بیٹے کو۔ جب کہ میری کوکھ سونی رہی۔ اب وہ زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ اب زیادہ تر میں ہی اس کے گھر، اُس سے اور بچوں سے ملنے چلی جاتی۔ اس کے بچوں کے ساتھ کھیل کر خوشی محسوس ہوتی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے اُس نے گورنس رکھ لی تھی کیونکہ اکثر اسے کانفرنس اور سیمینار میں شرکت کرنے کے لئے شہر اور ملک سے باہر جانا پڑتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جس قدر وہ کامیابی کشید کرنے میں پرجوش اور بے قرار رہتی ہے۔ ڈاکٹر دت اس کے بالکل برعکس پرسکون اور مطمئن نظر آتے ہیں۔

امید کا ہر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بھی میری کوکھ ہری نہ ہو سکی۔ مجھ میں ماں بننے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ یہ زمین بنجر تھی اور بنجر ہی رہی۔ میں افسردہ تھی۔ غموں کے ساگر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی دوست پلوی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی مگر وہ دور دور تک مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میری امیدوں کے برخلاف اُس وقت نوین نے مضبوط سہارا بن کر اپنی محبت اور دِن رات میرا خیال رکھ کر مجھے ٹوٹنے سے بچا لیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا پلوی اور میرے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ جیسے ہی میں نے محسوس کیا کہ اب اس کی زندگی میں میرا وجود بے معنی ہو گیا ہے، میں نے اپنے قدموں کو وہیں روک دیا۔ نہ کوئی گلہ کیا نہ شکایت کیونکہ اب رشتہ اس مرحلے سے بھی گزر چکا تھا۔ ہمارے بچپن کی دوستی خاموشی سے دم توڑ گئی۔ دوستیاں شاید حالات کے ساتھ بدل جاتی ہیں، ہماری دوستی کا بھی یہ ہی انجام ہوا۔ اب دنیاداری کے لئے کبھی سالگرہ کی مبارک دینے کے لیے اُس کا فون آ جاتا یا پھر میں اس کو بچوں کے جنم دن، اس کی سالگرہ یا پھر کبھی اخبار میں اسے کوئی ایوارڈ ملنے کی خبر پڑھنے پر فون کر دیتی۔ اگر کبھی باہر کسی تقریب میں ملنے کا اتفاق ہو جاتا تو ہم ایسے ہی ملتے جیسے کبھی کوئی دوری ہمارے بیچ آئی نہ ہو۔

شروع شروع میں اس کے بدلتے رویّے سے تکلیف تو بہت ہوئی تھی۔ اپنے دُکھ کو میں نے کبھی کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ نوین کو بھی اس کی بھنک تک نہ لگنے دی۔ پہلے چترنجن اور پھر پلوی کا بدل جانا، مجھے اندر تک توڑ گیا۔ ایسے محسوس ہونے لگا کہ مجرم میں ہی ہوں مجھ میں ہی کچھ کمی ہے جو میری محبت اور وفا کا صلہ مجھے بے رخی اور بے وفائی سے مل رہا ہے۔ ٹھکرائے جانے کا دکھ کیا ہوتا ہے، یہ وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس پر گزرتی ہے۔ پہلے جس قدر میں پریشان ہوتی تھی اب نہیں ہوتی۔ وقت ہر زخم بھر دیتا ہے۔ اب مجھے اس کی بے وفائی پر دُکھ نہیں ہوتا۔

اس سے بھی بڑھ کر میری زندگی میں اور مسائل آ کھڑے ہوئے ہیں۔ نوین کی اچانک وفات نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ یہ صدمہ اتنا گہرا تھا کہ لگتا تھا کہ میں اندھیری کھائی میں اوندھے منھ گر پڑی ہوں اور وہاں سے باہر نکلنے کی نہ مجھ میں قوت ہے اور نہ ہی خواہش۔ نوین مجھے بھری دنیا میں تنہا کر گئے۔ میرے جینے کا اب کوئی مقصد ہی نہیں بچا۔

میرے سسرال اور مایکے والوں نے اس وقت مجھے سنبھال لیا۔ پلوی اور ڈاکٹر دت بھی تعزیت کے لئے آئے۔ پلوی میرے گلے لگ کر زار و قطار روتی رہی مجھے حوصلہ دیتی رہی۔ روتے روتے بار بار کہے جا رہی تھی کہ ''اب میں تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ پہلے ہی مجھے آنے میں بڑی تاخیر ہو گئی۔''

میں خاموشی سے سنتی رہی۔ دل میں ہلکی سی ایک امید جاگی کہ شاید میرے ایسے کڑے وقت میں وہ مجھے سنبھال لے گی۔ میرے دکھ میں شریک ہو کر کچھ حد تک میرے اندر اس تکلیف کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا کر دے گی مگر وہ میری بھول تھی۔ نہ کچھ ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔

گنگا گئی ہڈیاں بھی کبھی واپس آتی ہیں۔جس وقت سب سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت تھی، وہ وعدہ کر کے بھی میرے پاس نہیں آئی۔

گزرتے وقت کے ساتھ مجھے بھی صبر آ گیا۔مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے؟ یہ بات الگ ہے کہ جانے والے کے ساتھ جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ کوئی پُر نہیں کر سکتا۔وقت گزر جاتا ہے اور یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔چھوٹی بہنوں کی طرح میری دیوارانی میرا خیال رکھتی ہے۔ اس کے دو جوان بچے ''بڑی ماں بڑی ماں'' کہہ کر لاڈ لڑاتے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد خود کو مصروف رکھنے کے لئے اپنے علاقے کے گھروں میں کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کو پڑھاتی ہوں۔انہیں پاس کے سرکاری سکول میں داخلہ دلوادیا ہے۔پانچ سال کی عمر سے لے کر چودہ سال کی عمر کے آٹھ بچے ہیں۔ اسکول سے سیدھے میرے گھر آتے ہیں۔ایک ملازمہ صرف اُن کے لئے دوپہر کا کھانا پکانے کے لئے رکھی ہے۔منہ ہاتھ دھو کر وہ کھانا کھا کر کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔اسکول کا کام کرتے ہیں اور جو سمجھ نہیں آتا، مجھ سے پوچھ لیتے ہیں۔شام کو ان کی مائیں کام سے لوٹتے وقت انھیں گھر لے جاتی ہیں۔میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے اور ان کی مائیں بھی بے فکر ہو کر اپنا کام کر لیتی ہیں۔

آج صبح ہی آدیت نے فون کر کے کہا ہے کہ وہ شام کو ملنے آئے گا۔میں نے کہا بیگم کو بھی ساتھ لے آنا، اسی بہانے اُس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔اس نے سپاٹ سا جواب دیا، ''آج نہیں پھر کبھی ملواؤں گا۔آج مجھے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔''

جانتی ہوں وہ بہت ساری کون سی باتیں کرنا چاہتا ہے۔پلوی کے دیے زخم کھرچے گا اور مجھے بھی تکلیف دے گا۔میں دل سے نہیں چاہتی کہ وہ مجھ سے ملنے آئے۔ ہماری دوستی کا جو بھرم اُس کے ذہن میں بنا ہے، وہ قائم رہے۔کس منھ سے اُس سے کہوں گی کہ بھائی جو حادثہ تیرے ساتھ پیش آیا تھا۔اس حادثہ سے میں بھی گزری ہوں۔مجھے اُس وقت سنبھل جانا چاہیے تھا جب تمہیں ٹھوکر لگی تھی۔کیسے کہوں گی اس سے کہ

جھلیا۔۔۔۔۔عشق کمانا اوکھا
کیسے نوں یار بنانا اوکھا
پیار پیار تے ہر کوئی کو کے
کر کے پیار نبھانا اوکھا۔

☆☆☆

افسانچہ

غلطی

رئیس احمد کمار

(قاضی گنڈ، کشمیر۔موبائل:9622904728)

وہ صبح سویرے نیند سے جاگ کر نماز ادا کرنے کے فوراً بعد قرآن پاک کی تلاوت کرنے میں اکثر مشغول رہتی ہے۔میرے لئے گرما گرم ہاتھ سے بنائی ہوئی عمدہ اور تازہ روٹیاں تیار کرتی ہے، گلابی رنگ کی نمکین چائے میرے سامنے رکھ کر اکثر میرے پاس ہی بیٹھی رہتی ہے۔میرے کپڑوں کو اچھی طرح دھو کر اور استری کر کے الماری میں سجا کر رکھ دیتی ہے۔

جب بھی مجھے کہیں بازار سے کچھ خریداری کے لئے جانا پڑتا ہے یا کسی شادی یا کسی اور تقریب میں شرکت کرنے کی غرض سے جانا ہوتا ہے تو وہ میرے لئے بہترین اور خوبصورت کپڑوں کا خود انتخاب کرتی ہے۔جب بھی میری طبیعت اچانک ناساز گار ہوتی ہے تو وہ خود ایک نرس کی طرح میرا خاص خیال رکھتی ہے اور وہی کچھ کھانے کے لئے پیش کرتی ہے جو طبیعت کے موافق ہو اور مضر صحت نہ ہو۔

غرض میری بیوی ایک فرمانبردار اور صالح عورت ہے جس کے لئے میں اپنے اللہ سے ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔۔۔۔۔

سلام الدین اپنے دوست رفیق کو اپنی بیوی کے بارے میں بتا رہا ہے۔۔۔

رفیق۔۔۔۔مگر اتنے سالوں میں آپ نے میرے سامنے اس کی کبھی ایسی تعریفیں نہیں کیں ہیں۔اچانک وہ آج کل کیسے اتنی فرمانبردار بیوی بن گئی ہے۔۔۔

سلام الدین۔۔۔مگر غلطی میری ہی تھی نا، میں مشترکہ خاندان میں مقیم تھا جہاں میرے والدین، بھائی اور بہنیں بھی ساتھ اکٹھے رہا کرتے تھے۔

☆☆☆

مرضی پور کا پاسدار

ڈاکٹر عارف انصاری

(برہانپور، مدھیہ پردیش۔موبائل:9993994141)

کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، قد کاٹھی تقریباً چھ فٹ چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے نشانات، داڑھی کے سیاہ بالوں میں سفیدی کی معمولی چمک، ٹھہا کہ مار کر ہنسنے والی زندہ دلی کا ثبوت دیتی غیر معمولی عادت۔ سر پر جالی دار سفید ٹوپی۔ گلے میں گہرے رنگ کا گمچھا جو کئی کئی کلومیٹر پیدل سفر کرنے میں اڑتے گرد وغبار سے چہرے اور آنکھوں کو محفوظ رکھنے میں کام آتا ہے۔ سادہ سے کرتے پاجامے میں ملبوس اس لفظی تصویر میں دکھائی دینے والے شخص کو علاقے کے لوگ پاسدار خاں ولد نامدار خاں کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔

پاسدار خاں دور تک پھیلی اپنی موروثی زمینوں سے کم وقت کی فصلیں لے کر اپنے پریوار کا پالن پوشن کرتا اور آم، چیکو اور کیلے کی فصلوں سے ہونے والی آمدنی وہ اپنے خاندان کی ترقی کے لئے اور ضرورت پڑنے پر قومی وملّی کاموں میں استعمال کرتا۔ کوہستانی سلسلے سے لگے ہوئے اس کے پیڑ پودوں کو قدرتی طور پر تحفظ حاصل ہے۔ خونخوار جنگلی جانور، ہرنوں کی ڈاریں، چیتل، نیل گائے، خرگوش، مور، ہریل، فاختائیں، ہدہد اور نجانے کون کونسے جانور اور پرندے اس کے باغات کی سیر کے لئے آتے، دانہ چگتے، پھل کھاتے اور پلک جھپکتے ہی پہاڑی سلسلے میں کہیں رو پوش ہوجاتے۔ پاسدار آپسی اتحاد کے قیام کے لئے بستی کے الگ الگ محلّوں میں بسنے والے ہندو، مسلمان، بودھ سبھی سے بلاتفریق مذہب وملّت ہمیشہ شرافت سے پیش آتا۔ اپنے گھر کے شادی بیاہ کے فنکشن میں انھیں بلاتا اور خود ان کی تقاریب میں بھی شرکت کرتا۔ پاسدار نوعمری کے زمانے سے ہی لذیذ کھانوں کا شوقین ہے۔ احباب اور رشتے داروں کے لئے چولہوں پر ہانڈی چڑھوانا اور دیگوں میں کھانے بنوانا اس کے گھر کی روایت کا حصّہ رہا ہے۔ دوستوں کے ساتھ جنگلات کی سیر کرنا اور دریا کنارے الگ الگ قسم کی مچھلیاں، دور سے منگوائے گئے سی فوڈ، گیلے بوٹل وغیرہ کے تری سے پر کھانے بنا کر کھانا اور کھلانا اسے بہت لطف دیتا، جنگلی جانوروں کے شکار پر پابندی نہیں ہونے سے اس کے احباب اکثر اسکی زبان کا ذائقہ تبدیل کرتے رہتے، لیکن جس طرح وہ دیہات کے ہر فرد کو جوڑے رکھنے کی کوششیں کرتا اور ان کے متعلق حسن ظن رکھتا، گاؤں کے سارے لوگ اس کے ساتھ ویسا ہی مخلصانہ روّیہ نہیں رکھتے تھے۔ گاؤں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کے طور طریق کو ناپسند کرتے اور پاسدار جس مقام پر تھا اس بلندی پر وہ اپنے آپ کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود پاسدار موقع پڑھنے پر انکا ساتھ دیتا ہے۔ وہ مشکل گھڑی میں اپنے آباء واجداد کے مصلحت اندیشانہ روّیئے سے ہٹ کر ظالموں کے خلاف اکثر ڈٹ کر کھڑا ہوجاتا اور اپنی جائز مانگیں منوانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ اس کے قومی وملّی کاموں میں اس کے نوعمری کے زمانے کے ساتھی اس کی ڈھال بن کر ہمیشہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ رہ کر اس نے کئی معرکے سر کئے تھے۔ بستی میں آپسی رنجش سے لے کر ناانّفاقی اور جاہلانہ رسوم جیسے مسائل کا انبار تھا۔ ایسے ماحول میں اپنی بات منوانے کا اہل بنانے کے لئے پاسدار خاں کو بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔

پاسدار خاں کی جی داری، تدبر وحکمت اور اس کے قولِ فیصلہ کو دیکھتے ہوئے لوگ اس کے پاس اپنے تنازعات، خانگی مسائل اور کھیت کھلیان کی زمین اور راستوں کے مسائل ومعاملات فیصل کرانے کے لئے لانے لگے۔ کچھ لوگ اگر اس کا فیصلہ ماننے سے انکار کردیتے تب بھی وہ ان سے ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا اور اکثر سمجھا بجھا کر حق بہ حقدار رسید کرنے کے مصداق انھیں انصاف دلانے کے لئے آخری وقت تک کوششیں کرتا رہتا ہے۔ پاسدار نے ایک مرتبہ اپنے کھیت میں گیہوں کی فصل اگانے کے لئے زمین میں بیج ڈالے، اتّفاقاً اس سال بارش کی عنایات گذشتہ برسوں کی بہ نسبت کم رہیں اور کچھ وقت بعد علاقے میں سوکھا پڑ گیا۔ زیادہ تر لوگوں کی کھیتیاں بارش کے پانی پر منحصر تھیں۔

پاسدار کی زمین پر الگ الگ دو سمتوں میں دو کنوئیں موجود تھے۔ سوکھا پڑنے سے واٹر لیول متاثر ہو گیا۔ جس کی وجہ سے گذشتہ سالوں کی بہ نسبت غلہ کم مقدار میں آیا۔ آس پاس کے کھیت پوری طرح بارش پر انحصار کرنے کی وجہ سے سوکھے کے سوکھے پڑے رہ گئے اور فصلیں جاگنے سے پہلے ہی سو گئیں۔ گاؤں والوں کے پاس کھانے کے لئے اناج کے نام پر کچھ بھی نہیں رہا۔ جب پاسدار کی زمین پر کنوئیں کے آدھے ادھورے پانی کے سہارے فصل آئی تو لوگ بطور معاونت غلہ مانگنے کے لئے اس کے در پر حاضر ہونے لگے۔ پاسدار کے بھائیوں نے اسے مفت میں غلّہ تقسیم کرنے سے منع کیا۔ مگر اس نے ہر کسی کو ایک ایک دو دو تھیلے غلہ دے کر مشکل گھڑی میں ان بندگانِ خدا کے کام آنے کی کوشش کی۔ وہ کہتا ''ہمارے علاقے کے یہ مزدور اور کسان آج مصیبت میں ہیں۔ یہ بھلے ہی کسی مذہب اور ذات برادری سے تعلّق رکھتے ہوں ان سے ہمارے تعلّقات ذرا کم ہونے کے باوجود ہمیں ان کی مدد کرنی چاہئے کہ اوّل آخر یہ لوگ انسان ہیں۔''

پاسدار آدمیت کا طرفدار فکر احسن رکھنے والا خوش مزاج شخصیت کا مالک ہے۔ وہ امیری غریبی، رنگ و نسل، ذات برادری اور چھوا چھوت جیسے مسائل سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس نے اسکول اور مدرسے کی اپنی نامکمّل تعلیم کے زمانے میں کچھ کتابیں ایسی پڑھ لی تھیں جن سے اس کے ذہن و دل کی کایا پلٹ گئی تھی۔ ایک مرتبہ پڑوسی گاؤں کے چند مسلمان پاسدار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: ''ہمارے گاؤں میں اکثریتی طبقہ یعنی ہندو مذہب کے ماننے والوں کے متعدد مکانات ہیں۔ دیگر ذات برادری سے تعلّق رکھنے والے لوگ بھی یہاں سکونت کرتے ہیں انھیں کے بیچ ہمارے بھی چھ آٹھ مکانات ہیں۔ جمعہ اور دیگر نمازوں کی ادائیگی کے لئے ہمیں دوسرے گاؤں جانا پڑتا ہے۔ گاؤں میں ایک بھی مسجد نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں ہماری اپنی مالکی کی زمین پر ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر ہو جائے، مگر گاؤں کا ماحول اب پہلے جیسا نہیں رہا اور تو اور خود ہمارے لوگ بھی اس راہ میں قدم بڑھانے سے ہمیں روکتے ہیں۔ ہم نے دو ایک مرتبہ کوششیں کیں مگر چند شر پسند عناصر ہمیں دھونس دھمکی دینے لگے۔ اس لئے معاملا اب تک جوں کا توں ہے۔'' جب وہ لوگ اپنی ساری باتیں کہہ کر خاموش ہو گئے تو پاسدار نے ان سے گاؤں کے مکھیا کی ذہنی اور سماجی کیفیت کے بارے میں دو تین سوالات کئے اور دو روز بعد ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے انھیں رخصت کر دیا۔

دو دن بعد پاسدار خاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گاؤں کے مکھیا کے مکان پر حاضر تھا۔ مکھیا سے مصافحہ کرنے کے بعد پاسدار نے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر اپنا مدعا چھیڑ دیا۔

''مکھیا جی! ہم نے آپ کی انصاف پسندی اور قومی ایکتا کے جذبے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ آپ مشکل سے مشکل مسئلہ پلک جھپکتے ہی حل دیتے ہیں۔ آپ کا گھر نیائے کا مندر ہے۔ آپ واقعاً پنیہ کا کام کر رہے ہیں۔'' مکھیا جہاندیدہ آدمی تھا یہ سب سن کر وہ اتنا تو سمجھ ہی گیا کہ داڑھی ٹوپی والے مسلمانوں کی یہ بھیڑ ضرور کوئی سمسیا لائی ہے۔ اس نے پاسدار کی بات مکمّل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔'' ''آپ تو سمسیا بتائیں شریمان!.... میں سمادھان کرنے کے لئے تیّار ہوں۔''

پاسدار کو گاڑی پٹری پر آتی دکھائی دی تو اس نے من ہی من میں چند جملے تخلیق کئے اور اپنے اندر کے اصول پسند پاسدار کے ہونٹوں پر قفل لگاتے ہوئے، اس کا باہری دکھاوے والا پاسدار فوراً مقصد براری کے لئے تیّار ہو گیا۔ اسے اب نپے تلے انداز میں ایک اہم بات کہنی تھی، چنانچہ حلق میں تھوک نگلتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ کچھ اس طرح اپنی بات کہنی شروع کی، اس کے الفاظ تھے۔'' مکھیا جی! دراصل بات یہ ہے کہ آپ کے گاؤں میں دیگر ذات برادری کے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کے بھی چھ آٹھ مکانات ہیں۔ کھلے آسمان کے نیچے یہ لوگ آپ جیسے بڑے لوگوں کی سرپرستی میں سانس لے رہے ہیں۔ پوجا پرستش کے لئے سبھی لوگوں کی اپنی اپنی عبادت گاہیں اور مندر ہیں۔ مگر یہ بیچارے اس معاملے میں یتیم ہیں انھیں عبادت کے لئے دور دراز کے گاؤں جانا پڑتا ہے۔ یعنی اس گاؤں میں اپنے خدا کی پوجا پرستش کے لئے ان کے پاس ایک بھی مسجد نہیں ہے۔ جہاں یہ اکانت میں اپنے ایشور کو یاد کر سکیں۔ مالک نے آپ کو مان سمّان دیا ہے، عہدہ دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں ان لوگوں کی اپنی مالکی کی زمین پر ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر ہو جائے۔'' یہ بات کہتے ہوئے وہ تھوڑا

رکا اور پھر چہرے پر مسکان لاتے ہوئے، ڈرامائی انداز میں کہنے لگا۔ ''اور ہاں .....میں تو یہ کہنا ہی بھول گیا کہ ہم اس کی بنیاد آپ کے ہاتھوں سے رکھوانا چاہتے ہیں۔'' پاسدار کی بات ختم ہوتے ہی مکھیا نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے .....زمین آپ کی .....عبادت گاہ آپ کی .... پھر مجھے کیا آپتی ہوسکتی ہے۔ آپ تو بتائیں مجھے کدالی کہاں لگانی ہے۔'' مکھیا کی بات سنتے ہی حاضرین کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

موقع کو غنیمت جان کر پاسدار خاں بغیر ایک منٹ کی دیری کئے مکھیا کو لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور سارے لوگ فوراً سے پیشتر مقام مقصود پر جا پہنچے۔ مکھیا نے بڑی آن بان اور شان کے ساتھ کدالی لگائی۔ اس کے ساتھیوں نے فوٹو وغیرہ بھی نکالے۔ مگر پھر پاسدار خاں نے کمالِ ہوشیاری سے مکھیا کے ہاتھوں سے کدالی لیتے ہوئے کہا۔ ''مکھیا جی! آپ تھک جائیں گے ...بس اتنا کافی ہے۔'' اور اعوذ باللہ بسم اللہ پڑھ کر وہ دور تک کدالی سے زمین کھودتا چلا گیا۔ کچھ لوگ اس کی اس چالاکی کو مسکراتے ہوئے انداز میں دیکھنے لگے۔ پاسدار کی باتوں میں ایسا جادوئی اثر تھا کہ اس کے جملے سن کر پتھر بھی پانی ہوجاتا۔ چند مہینوں کی کوششوں کے بعد گاؤں میں مدرسہ کے ساتھ تعمیر ہوئی اس مسجد سے اللہ اکبر کی صدائیں گونجنے لگیں۔

پاسدار خاں کی اجتماعی امور میں کامیابی کے سبب اس کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ وہ اوپر سے ناریل کی طرح سخت مگر اندر سے بالکل نرم تھا۔ کمیونیٹی کے معاملات نمٹانے کے لئے تدبیریں کرنے میں اس کو ملکہ حاصل تھا۔ وہ کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے نہ ہونے کا قائل نہ ہو کر میدان میں اتر کر اپنے ہاتھ سے کام انجام دینے کے فلسفے میں یقین رکھتا ہے۔

ایک مرتبہ پاسدار کے بھائی زردار خاں کے حصّے کی زمین سے لگے سوکھے کنوئیں میں کسی نے بڑے بڑے سیاہ بالوں والے جنگلی جانور ریچھ کی ڈیڈ باڈی لاکر پھینک دی۔ تھوڑے وقت بعد آس پاس کے علاقے میں بدبو پھیلنے لگی۔ راہ گیروں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو انھیں اندر مردہ ریچھ پڑا دکھائی دیا۔ کسی منچلے نے خان فیملی کو پریشان کرنے کے مقصد سے محکمۂ جنگلات کے دفتر میں شکایت کردی۔ خبر ملتے ہی اگلے دن فاریسٹ افسران کی گاڑیاں دندناتی ہوئیں مرضی پور پنچایت پہنچ گئیں۔ سرپنچ نے معاملے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے زردار خاں کو فون لگایا۔ زردار جنگلی جانوروں کو مارنے کی سزا والے سخت قانون کے نفاذ کی خبر سے پہلے ہی خوفزدہ تھا۔ یہ ماجرا سن کر وہ اور زیادہ خوف میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے اس بات کی جانکاری فوراً اپنے بھائی پاسدار کو دی۔ پاسدار نے اس کی باتیں بغور سنیں اور معاملے کی گمبھیرتا کو سمجھتے ہوئے نیز سرپنچ پر کئے گئے احسانات کو دھیان میں رکھتے ہوئے داڑھی پر ہاتھ پھیرنے کے سے انداز میں اس نے اپنے بڑے بیٹے جاں نثار خاں کو سرپنچ کا نمبر ملانے کا حکم دیا۔

''سرپنچ صاحب! میں بول رہا ہوں ..... پاسدار خاں .....'' آداب وسلام کے بعد نرم لب ولہجے میں اس نے آہستہ آہستہ اپنی بات کہنی شروع کی۔ ''صاحب جی! اصل میں وہ کھیت جس کے کنوئیں میں مردہ ریچھ پڑا ہونے کی خبر گاؤں میں پھیلی ہے وہ زردار خاں کا نہیں میری مالکی اور قبضے کا کھیت ہے۔ اس لئے سارے سوال وجواب مجھ سے ہونے چاہئے .....اور میں! ابھی اپنی زمین سے کئی کلومیٹر دور ایک دوسری بستی میں ہوں وہاں پہنچنے میں مجھے ذرا دیر لگے گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں آپ مجھے دو گھنٹے کا وقت دیں۔ فاریسٹ کی ٹیم کو کھانا وانا کھلائیں میں کھیت پہنچ کر آپ کو فون کرتا ہوں'' سرپنچ نے بغیر چوں چرا کئے پاسدار کی بات مان لی۔ پاسدار کے لئے دو گھنٹے کا وقت اگرچہ ناکافی تھا۔ پھر بھی پاسدار دو گھنٹے میں اس مشن کو مکمّل کرنے کے لئے میدان میں اتر گیا۔ اس نے بہت تیزی سے ضروری ساز وسامان اکھٹا کیا اور اپنے بھائی بھتیجوں کی ٹیم کے ساتھ کچھ ہی دیر میں دوسرے راستے سے موقعۂ واردارت پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر ایک موٹے رسے کے سہارے پاسدار نے بھتیجے کو کنوئیں میں اترنے کے لئے کہا مگر بدبو اتنی شدید تھی کہ کوئی بھی اس سوکھے بدبودار کنوئیں میں اترنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ پاسدار نے پہلے تو بیٹوں، بھتیجوں کو دو موٹی موٹی گالیاں دیں پھر معاملے کی نزکت کو دھیان میں رکھتے ہوئے۔ اس مشن کی از خود کمان سنبھال لی۔ اس نے سر اور ناک پر بڑا سا گمچھا لپیٹا ایک عطر کی شیشی جیب میں ڈالی، ایک دھاردار بڑا سا ہتھیار کنوئیں میں پھینکا اور رسّے کے

سہارے آہستہ آہستہ نیچے اتر گیا۔ پاسدار ریچھ کے ٹکڑے کر کے رسّے کے سہارے اوپر بھیجتا جاتا اور اس کے بچے بھیجے کنوئیں سے کچھ دوری پر بڑی بڑی لکڑیوں سے دہکائی گئی آگ میں ان ٹکڑوں کو موٹر سائیکل کے سہارے لالا کر پھینکتے جاتے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اس خفیہ آپریشن کو انجام دیا گیا۔ دو گھنٹے بعد جب سرپنچ کی رہنمائی میں فاریسٹ افسران کی ٹیم موقع پر پہنچی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ محکمۂ جنگلات کی ٹیم چند منٹ وہاں ٹھہرنے کے بعد ہاتھ ملتے ہوئے شکست خوردہ انداز میں وہاں سے خاموشی سے نکل گئی۔

ریچھ کی ڈیڈ باڈی کو ٹھکانے لگانے کا معاملا ہو یا کسی بھی طرح کا کوئی مسئلہ ہو پاسدار موجوں کے خلاف تیرا کی کر کے اپنے ہدف تک پہنچ ہی جاتا۔ فاریسٹ ٹیم کے بیرنگ واپس لوٹنے کے بعد سرپنچ نے پاسدار خاں سے مردہ ریچھ کی باڈی اچانک غائب ہو جانے کی حقیقت جاننے کی بہت کوشش کی مگر پاسدار نے سرپنچ کے سامنے پردے کے پیچھے کی حقیقت کا کبھی بھی انکشاف نہیں کیا۔ اس طرح کے معاملات کی بروقت کمان سنبھال کر اسے انجام تک پہنچانا اور اہلیانِ دیہات کے معاشی، معاشرتی اور خانگی مسائل کو حل کرنے جیسے پاسدار کے اس طرح کے واقعات کا طویل سلسلہ ہے۔ جس میں سے ہر ایک پر گفتگو ممکن نہیں ہے۔

پاسدار کی زندگی مشکل پسندی سے عبارت ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی اسی ڈگر پر چل رہا تھا۔ سردی گرمی اور موسم برسات کے تھپیڑوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اپنی زندگی کے دن ہنسی خوشی گزار رہا تھا۔ پہلے کی بہ نسبت اس کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ ایسے ہی ماحول میں جب پاسدار خاں مشترکہ خاندان کا رکن رکین تھا۔ ایک دن ایک نوعمر دیہاتی لڑکا اپنا خانگی مسئلہ لے کر پاسدار سے ملنے کے لئے اس کے درِ دولت پر حاضر ہوا اور پاسدار کو بلانے کے لئے اس نے ''داداجی!....'' کہہ کر بآواز بلند آواز لگائی۔ لڑکے کی آواز سن کر ایک چھ سات سالہ بچّہ دروازے سے باہر آیا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ نوجوان نے اشارے سے پوچھا ''داداجی گھر میں ہیں''۔ بچے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں.... میرے دادا ابھی گھر پر نہیں ہیں۔'' نوجوان اس بچّے کو پہچانتا تھا۔ وہ زردار خاں کا پوتا تھا۔ نوجوان نے اس سے فوراً پوچھا۔

''بابا.... آپ کے دادا کا نام زردار خاں ہے نا؟۔'' بچّے نے اثبات میں سر ہلایا تو نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے دادا، آپ کے دادا ہیں ..... مگر مجھے ان سے کام ہے جو سارے گاؤں کے دادا ہیں'' بچّہ ہنستا ہوا گھر میں داخل ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر میں پاسدار خاں دروازے پر موجود تھا۔

پاسدار خاں کی بڑھتی مقبولیت کے سبب لوگ اسے پہلے سے زیادہ پسند کرنے لگے تھے۔ اس کی اسی مقبولیت اور جذبۂ انسان دوستی کے پیش نظر اس کے دوست احباب اسے سرپنچ کا چناؤ لڑانے کے لئے ضد کرنے لگے۔ پاسدار تو لوگوں پر کئے گئے احسانات کو ''نیکی کر دریا میں ڈال'' کی مثل ہی رہنے دینا چاہتا تھا، مگر اس کے دوست احباب اور اہل خاندان اس کی مقبولیت کو کیش کرانے پر آمادہ تھے پنچ کا چناؤ جیتنا تو اس کے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر سرپنچ کے انتخابات میں فتح حاصل کرنا مشکل ہونے کے ساتھ مالی خسارے کا سودا بھی تھا۔ ان ساری باتوں پر گہرا منتھن ہوا، مباحثے ہوئے مگر اس کے چاہنے والوں نے انتخابات میں حصّہ لینے کے لئے اسے راضی کر ہی لیا۔ اس کے سیاسی میدان میں اترنے کی خبر عام ہوتے ہی حکمراں جماعت کے افراد اس کے دشمن بن گئے اور اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ مگر پاسدار ایک الگ ہی مٹی سے بنا ہوا انسان تھا۔ وہ آہنی بازوؤں والا مرضی پورا سٹیج کے ڈرامے کا ایک بالکل انوکھا کردار تھا۔ وہ ان کی گیدڑ بھپکیوں میں کہاں آنے والا تھا۔ وہ اس طرح کے پیغام لانے والوں پر ہنستا اور ان سے کہتا ''میرے دس جاں نثار..... دس فوجوں کے سپہ سالار جیسے ہیں۔ ان میں اتنا بارود بھرا ہوا ہے کہ یہ دشمنوں کے دو چار مکانات تو کجا پلک جھپکتے ہی پورا کا پورا گاؤں جلا کر راکھ کر سکتے ہیں۔'' لیکن پاسدار کی اس طرح کی باتیں صرف اس کی کوٹ نیتی کا حصّہ تھیں۔ اس نے میکیاولی کی کوٹ نیتی پڑھی تھی۔ میدان سیاست میں آتے ہی وہ اپنا بھولا سبق یاد کرنے لگا۔ اس طرح کی دو تین جمع خرچ نے مقامی سیاست میں پاسدار کے پیر مضبوط کر دیئے اور تھوڑے ہی وقت میں سیاست دانوں پر اس کی دھونس بیٹھ گئی۔ نتیجے کے طور پر پاسدار خاں کے لئے

چناؤ لڑنے کی راہ آسان ہوگئی۔ پاسدار کے بے لوث کارنامے اس کی مقبولیت کا سبب بنے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مرضی پور پنچایت میں سر پنچ کی کرسی پر متمکن ہوگیا۔ اس منصب کے توسط سے اس نے گاؤں میں خوب کام کیا۔ وہ عوامی فلاح کے لئے اپنے پاس سے پیسہ خرچ کر کے مرضی پور گرام کے ساکنان کے لئے کام کرتا مگر مخالفین تو مخالفین تھے وہ اس کے اچھّے کام میں بھی مین میخ نکالتے۔

پاسدار خاں زندگی بھر کے اپنے تجربات ومشاہدات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ بغیر تعلیم کے سب کچھ ادھورا ہے۔ عصری تعلیم کی کمی کی وجہ سے اکثر اس کے قدم بھی ڈگمگا جاتے تھے۔ یہی سب سوچ کر اپنے کنبے قبیلے اور گاؤں کے لوگوں کی ترقی اسے تعلیم کے حصول میں مضمر نظر آنے لگی۔ جب اس نظر سے اس نے گاؤں کے سرکاری اسکول پر نظر دوڑائی تو اسے مرضی پور کا خستہ حال اسکول اور وہاں کا نظم بہت پسماندہ دکھائی دیا۔ گاؤں میں اس وقت صرف آٹھویں جماعت تک تعلیم کا بندوبست تھا۔ پاسدار خاں نے اس سلسلے میں گاؤں کے لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوششیں شروع کیں اور مرضی پور گرام میں ہائی اسکول اور ہائر سیکنڈری تک تعلیم کا بندوبست کروانے کے لئے تحریک چھیڑ دی۔ اس کام کے لئے پیسہ پانی کی طرح بہایا جانے لگا۔ سیاست دانوں اور راجدھانی کے متعلقہ دفاتر کے کئی کئی چکر لگانے پڑے۔ کئی سالوں کی مسلسل جد و جہد کے بعد پاسدار ایک دن ضلعی صدر مقام پر سکونت کرتے منسٹر صاحب کی خدمت میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حاضر ہوا۔ سارا معاملا سننے کے بعد منتری مہودے نے کہا ''یار... تم تو مخالف پارٹی کے آدمی ہو ہم تمہارا کام کیسے کریں'' پاسدار نے ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد کہا ''منتری جی... آپ کی بات بالکل صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے میں اور میرے یہ ساتھی آئندہ بھی وَپ کی پارٹی سے نہیں جڑ سکیں گے... ہماری آپ کے پاس آنے کی وجہ وہ معصوم اسکولی بچّے ہیں جن کا مستقبل اندھیرے میں جارہا ہے۔ ہمارے پاس ہماری پارٹی کے طاقتور لوگ بھی ہیں۔ مگر صاحب.... ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ زبانی جمع خرچ نہیں، کام کرتے ہیں۔'' پاسدار کی باتیں سن کر منتری کے چہرے پر ہنسی کھل گئی۔ بس پھر کیا تھا اس کی اور اس کے ساتھیوں کی محنت رنگ لائی۔ نتیجے کے طور پر محکمۂ تعلیم کو مرضی پور گرام میں ہائر سکینڈری اسکول شروع کئے جانے کی منظوری مل گئی۔ پاسدار کو نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے لئے کئے گئے اس کام سے سب سے زیادہ خوشی ملتی۔ کوئی بچّہ بورڈ کی جماعت میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوتا یا اس اسکول سے تعلیم حاصل کر کے ملازمت کے شعبے میں جاتا تو پاسدار بچّے کی کامیابی میں اپنی کامیابی بھی دیکھتا، اور خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

مرضی پوری چمنستان ہندوستان کا ہمیشہ سے سرسبز وشاداب علاقہ رہا ہے۔ یہاں کی زمین سونا اگلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرداروں کی حریص نظریں یہاں کی زمینوں پر برسوں سے لگی ہوئی تھیں۔ جب زمین داروں نے انھیں مہنگی قیمتوں میں بھی اپنی زمینیں فروخت کرنے سے انکار کر دیا تو دشمن طبیعت زرداروں نے ان کے بچّوں کو سازش کے تحت بگاڑنے کی کوششیں شروع کر دیں اور ان میں بری عادتوں کا ایسا میٹھا زہر ڈالا کہ دیہات کے کئی لوگوں کی بنیادیں ہل گئیں۔ پھر بھلا پاسدار اس وبا سے کیسے محفوظ رہ پاتا۔ نتیجے کے طور پر اس کی زمینیں بھی فروخت ہونے لگیں اور مستقبل کی فکر کے آثار اس کے ماتھے کی شکن میں صاف صاف دکھائی دینے لگے۔ اور پاسدار ایک چھوٹے سے قطعۂ آراضی میں قید ہو کر رہ گیا۔

پاسدار خاں کو گنگا جمنی تہذیب کی علامت کہے جانے والے مرضی پور کے محلّوں میں اصلاح وسدھار کی کوششیں کرتے کرتے کئی دہائیاں گذر چکی تھیں۔ اس کی نوعمری کے زمانے کے دو تین جانثاروں کو چھوڑ کر سب کے سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ گلوب کی تبدیلی کے ساتھ اب مرضی پور سے بیل گاڑی کلچر کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا۔ اب ہر دوسرے مکان مالک کے پاس موٹر سائیکل اور بڑے دہقانوں کے گھروں پر ٹریکٹر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ صبح سویرے کھیت جانے کی فکر میں سرِشام بتی گل کر کے نیند کی آغوش میں چلے جانے والوں کی تعداد معمولی رہ گئی تھی۔ نماز فجر میں مصلیان کی تعداد گھٹ کر آدھی ادھوری صف میں سمٹ گئی اور دکانوں پر گاہکوں کا بے ہنگم شور، شب میں گھروں سے ٹی وی پر ملکی اور عالمی خبروں کے ساتھ فلمی گانوں اور ہندی فلموں کی فائٹ کے بے جا شور سے پڑوسیوں کی نیند میں خلل پیدا ہونے لگا تھا۔

شطرنج اور موبائل فونز پر گیم کھیلنے والے بے راہ روی کے شکار نوجوانوں کی ٹولیاں اپنے اپنے کھیلوں میں منہمک دکھائی دیتیں۔ ہمسایوں کے آپسی جھگڑوں اور برادری کے برتری والے تنازعات نے زور پکڑ لیا تھا۔ اس طرح کے مسئلوں کی گتھیاں سلجھانے اور آپسی جھگڑوں کے صلح سمجھوتہ کرانے کے لئے اقلیتی اور اکثریتی طبقات سے تعلق رکھنے والے اہل ثروت، اور نئے نئے پنچ اور سرداران منصف کے طور پر اپنے آپ کو متعارف کرانے لگے تھے۔

پاسدار خاں اب پوری طرح پیرانہ سالی کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں پر موٹے چشمے کی عینک کے ساتھ دانتوں اور بالوں پر نزلے کے اثرات صاف طور پر دکھائی دینے لگے تھے۔ بھنوؤں کے بال بھی بگلے کے پر کی طرح سفید ہو کر گرنے لگے تھے۔ اس کے لباس جسم کے ریشم کی رونق ماند پڑنے لگی تھی۔ مگر اہلِ خانہ کی کفالت کی ذمہ داری اور ''میرے بچّے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے'' جیسی مجبوری کے پیش نظر وہ عمر کے اس پڑاؤ پر بھی کھیت کھلیانوں کی بچی کھچی زمین سے وابستہ رہتا۔ اس کا زیادہ وقت بستی سے دس کلومیٹر دور اپنے مزرعوں میں ہی گزرتا، وہ مہینے دو دو مہینے مسلسل اپنے پیڑ پودوں کی پرورش میں لگا رہتا اور اہل خانہ کی مزاج پرسی کے لئے کبھی کبھار ہی بستی کا رخ کرتا۔

ایک دن گاؤں میں برسوں سے چلے آرہے ایک تنازعے نے زور پکڑ لیا اور مسجد، مدرسہ اور قبرستان کی تولیت کو لے کر دو گروہوں میں جھگڑا پڑ گیا۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی، اور برسوں پرانی آپسی اتحاد و سالمیت کی روایت کے شیشے میں بال پڑنے لگا۔ روایت کا شیشہ ٹوٹ پھوٹ کر پارہ پارہ نہ ہو جائے اس خیال سے گاؤں کی سدھار کمیٹی دونوں فریقین کے درمیان آپسی سمجھوتہ کرانے میں جٹ گئی۔ بیسیوں بار کی کوششوں کے باوجود بھی اونٹ کسی کروٹ بیٹھنے کو تیار نہیں ہوا۔ ایک گروپ اکثریتی طبقہ کے چودھری پٹیلوں کو ثالث بنانے کی بات کرتا تو دوسرا طبقہ کورٹ کچہری کر کے مخالفین کو سزا دلوانے پر بضد نظر آنے لگا۔ شہر سے علما و مفتیان کو بلایا گیا۔ مگر کمیٹی کے لوگوں کی طبیعت میں انانیت کا ایسا نشہ چھا گیا تھا کہ وہ کسی کی بھی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ معاملہ کسی حال سلجھ نہیں رہا تھا۔ ایسے میں کچھ اہل فکر و نظر بزرگ اور بازی گر قسم کے لوگوں نے روز آنہ کے ان جھگڑوں سے تنگ آ کر دونوں کمیٹیوں کے ارکان کو سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر آپ لوگوں نے پندرہ دن میں آپسی سمجھوتہ نہیں کیا تو دونوں گروہ کو بزور قوت اس ذمہ داری سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دست بردار کر دیا جائے گا۔'' کیا اکثریتی طبقہ اور کیا اقلیتی طبقہ تب سے گاؤں کے ہر ہر فرد کی نظر اس معاملے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ دن گنے جانے لگے۔ ایک دن دو دن، پانچ دن، ہفتہ، دس دن، بارہ دن اور پھر پندرہویں دن کا سورج بھی نمودار ہو گیا۔ سبھی کو مغرب کی اذان کا انتظار تھا، مگر حیرت انگیز طور پر نماز عصر کے بعد دونوں طرفین کے اراکین مسجد کمیٹی کے دفتر میں حاضر ہوئے، گاؤں کے خاص خاص لوگوں کو بلایا گیا اور دو دو سال اپنی اپنی کمیٹی کے توسط سے خدمات پیش کرنے کے لئے راضی بہ رضا رہنے والے سمجھوتے کے کاغذات، مصلیان اور اہل دیہات کے درمیان پیش کر دیئے گئے۔ جو لوگ اس جھگڑے کو مزید بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے وہ دل مسوس کر رہ گئے اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گاؤں کے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے محفل میں سمجھوتے کے کاغذات پر لکھی تحریر بآواز بلند پڑھنے کی گزارش کی گئی۔ نوجوان نے آہستہ آہستہ ساری تحریر پڑھ دی۔ آخر میں دونوں کمیٹیوں کے دستخط کنندگان کے خانے میں کمیٹیوں کے ارکان کے نام پڑھنے کے بعد دستخط، سمجھوتہ کرانے والے: لفظوں کے مجموعے کی اس نے جوں ہی بلند خوانی کی، کمرے میں پن ڈراپ سائلنس کی سی خاموشی چھا گئی اور آخر میں نوجوان نے ..... سمجھوتہ کرانے والے ثالث کے نام کے طور پر ... پاسدار خاں ولد نامدار خاں ساکن مرضی پور، ضلع گمنام پور پڑھا تو سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں.... حاضرین محفل نے پاسدار خاں کے محفل میں موجود نہ رہتے ہوئے بھی اس کے فکر انگیز وجود کو وہاں محسوس کیا اور اس خوش آئند فیصلے کا پرخلوص انداز میں استقبال کرتے نیز دونوں کمیٹی کے اراکین کو آپس میں گلے ملانے کی تجدید کرتے ہوئے لوگ وہاں سے خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

چراغ تلے برسرِ روزگار معاوضہ

تنویر اختر رومانی

(جمشید پور، جھارکھنڈ۔ موبائل:700438485)

(۱)

''ارے میاں، لباس کی بات کرتے ہو۔۔۔۔لباس ہی تو انسان کی تہذیب وتمدن کا غمّاز ہوتا ہے۔۔۔۔ہماری تو خود ایک زندہ جاوید تہذیب ہے، مگر ہم دوسروں کی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔۔۔یہ آج کے فیشن ایبل لباس، جن سے بدن کے ہر عضو کی جھلکیاں نوجوان دلوں میں تلاطم پیدا کر دیتی ہیں۔۔۔۔آج ایسے ہی لباس سے معاشرے میں فحاشی بڑھتی جا رہی ہے۔۔۔۔اسلام نے جو لباس متعین کیا ہے اسی میں ہمارے لئے فلاح ہے، اسلام نے عورتوں کو حجاب میں رہنے کی اسی لئے تاکید کی ہے کہ کوئی نامحرم انہیں اپنی ہوس بھری نگاہوں میں مقید نہ کر لے۔'' باریش مرزا صاحب یارانِ فہم کے حلقے میں بیٹھے اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ فرّاٹے بھرتی ہوئی ایک کار وہاں آ کر رکی اور۔۔۔۔اور پھر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں رک سی گئیں کیونکہ کار سے ایک نہایت ہی خوبصورت، جوان اور ایمان شکن حسینہ چست پینٹ اور پھولدار شرٹ میں ملبوس اتر رہی تھی۔ اس نے براہ راست مرزا صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ''جلدی چلئے۔۔۔۔حامد میاں کو پولس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔'' مرزا صاحب بوکھلا کر اٹھے اور میز پر رکھی ٹوپی کو سر پر جمایا۔ اور پھر کار انہیں لے کر فرّاٹے بھرتی چلی گئی۔

ان کے جانے کے بعد لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ''تعجب ہے، ان کا لڑکا گرفتار ہو گیا؟'' ''ارے ہوگا پھر کوئی چکّر۔۔۔۔پہلے بھی تو جیل جا چکا ہے۔'' ''مگر وہ لڑکی کون تھی؟'' کسی نے پوچھا۔ دوسرے نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔ ''ان کی بیٹی۔''

(۲)

گریجویشن کے بعد تین سال تک مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد جب کہ گھر والے بھی اکتا گئے تھے تو اس نے ایک دن گھر والوں کو خوش خبری سنائی۔ ''مجھے نوکری مل گئی۔'' ضعیف العمر ماں نے خدا کا شکر ادا کر کے پوچھا۔ ''کہاں نوکری ملی؟'' ''ایک صاحب کے یہاں۔'' ''تنخواہ کتنی ہوگی بھائی جان؟'' بہن نے پوچھا۔ ''تین ہزار روپئے ماہانہ۔'' ''بس۔۔۔لیکن چلو خدا کا شکر ہے۔۔۔۔کچھ تو ہے۔'' ماں کے لہجے میں تھوڑی آسودگی تھی۔ ''لیکن بھائی جان!۔۔۔۔کام کیا کرنا ہوگا؟'' بہن نے پوچھ لیا۔ ''کام؟'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔ چہرے کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس سوال پر اسے بہت دکھ ہوا ہے۔ آخر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''کام بس اتنا ہے صاحب کے کتّے کو روزانہ صبح نہلانا دھلانا اور شام کو پارک لے جا کر سیر کرانا۔۔۔۔'' کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا اور ماں بیٹی حسرت و یاس سے اسے تکتی رہیں۔

(۳)

کلکٹر صاحب کا ایک دفتر ان کی سرکاری رہائش گاہ پر بھی تھا۔ مارچ کا مہینہ ختم ہونے والا تھا، جس کے سبب کام کی زیادتی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس شام اپنی پرسنل سکریٹری کو روک لیا۔ رات کے کھانے کے بعد دونوں دفتر میں مصروفِ کار ہو گئے۔ اہلِ خانہ کو سختی سے تاکید کر دی گئی کہ بہت کام ہے، ہو سکتا ہے پوری رات مصروف رہنا پڑے۔ اس لئے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ صبح کو اپنی سکریٹری کو رخصت کرتے وقت انہوں نے اپنے پرس سے ایک ہزار روپئے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ نوٹ لینے کی بجائے اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ''کیا سر؟۔۔۔۔آپ کی حیثیت اپنے بیٹے سے کم ہے کیا؟'' ''کیا مطلب؟'' کلکٹر صاحب نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ پرسنل سکریٹری کا جواب تھا۔ ''وہ تو ایک بار کے دو ہزار دیتے ہیں۔''

☆☆☆

کتاب کا نام	:	''خاکوں کا نگار خانہ''
مرتب	:	ڈاکٹر محمد اشرف
مبصر	:	ڈاکٹر محبوب حسن اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، ڈی ڈی یو، گورکھپور یونیورسٹی
قیمت	:	۳۰۰/روپے صفحات : ۳۶۳
اشاعت	:	۲۰۲۵ء
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

ڈاکٹر محمد اشرف کا شمار اردو کے بزرگ فکشن ناقدین میں ہوتا ہے۔ موصوف کو اردو کے افسانوی اور غیر افسانوی ادبیات سے خاص دلچسپی ہے۔ عصمت چغتائی کے خاکوں اور دیگر غیر افسانوی نگارشات پر مشتمل ان کی تازہ ترین کتاب ''خاکوں کا نگار خانہ'' زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب عصمت چغتائی کی تخلیقات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خوبصورت تحفہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر ڈاکٹر محمد اشرف کو صمیم قلب سے مبارکباد۔ اس سے قبل بھی فکشن اور نان فکشن تنقید پر مشتمل ان کی کئی تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ڈاکٹر محمد اشرف کو عصمت چغتائی کے حوالے سے اتھارٹی حاصل ہے۔ موصوف نے زندگی کا کچھ عرصہ عصمت چغتائی کے ساتھ گزارا ہے۔ عصمت چغتائی کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کو قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ ''خاکوں کا نگار خانہ'' سے قبل عصمت چغتائی کے حوالے سے ان کی دو مزید کتابیں ''اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ'' اور ''عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات'' منظر عام پر آ چکی ہیں۔ عصمت چغتائی کی باغیانہ تنقید'' کے عنوان سے ایک اور کتاب عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''خاکوں کا نگار خانہ'' میں عصمت چغتائی کی غیر افسانوی تخلیقات شامل ہیں۔ مرتب نے عظیم بیگ چغتائی، مجاز، منٹو، سجاد ظہیر، کرشن چندر، جان نثار اختر، پطرس بخاری، خواجہ احمد عباس اور میراں جی جیسے اہم شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت پر مشتمل کل بارہ شخصی خاکے شامل کیے ہیں۔ افسانوی خاکہ کے تحت سات خاکے شامل کتاب ہیں۔ کتاب کے آخر میں دو رپورتاژ بعنوان بمبئی سے بھوپال تک'' اور یہاں سے وہاں تک'' کتاب کی اہمیت میں اافہ کر رہے ہیں۔ عصمت چغتائی نے فکشن کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی میدان میں بھی اپنے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان کے خاکے اور رپورتاژ مختلف کتابوں اور رسالوں میں بکھرے پڑے تھے۔ ڈاکٹر محمد اشرف نے ادبی دیانتداری کے ساتھ ان تحریروں کو یکجا کیا اور متنی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں انھیں شائع کر دیا۔ اس تصنیف میں 34/صفحات پر مشتمل نہایت طویل مقدمہ شامل ہے، جس میں ڈاکٹر محمد اشرف نے خاکہ کے فن اور روایت پر بے حد کارآمد اور مفصل گفتگو کی ہے۔ معروف ناقد و محقق پروفیسر رئیس انور نے ڈاکٹر محمد اشرف کے مقدمہ اور ''خاکوں کا نگار خانہ'' کے مشمولات سے متعلق لکھا ہے: ''مرتب نے بڑی ذمہ داری سے مجموعہ کا ''پیش گفت'' لکھا ہے۔ اس کی ابتدا میں اردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد مشمولہ خاکوں اور رپورتاژ کی معروضی و موضوعی خصوصیات کا مختصرا جائزہ لیا ہے۔ مرتب نے کوشش کی ہے کہ خاکوں کے حوالے سے عصمت چغتائی کی ذہنی افتاد، زاویہ نظر اور فنکارانہ جہتیں ابھر کر سامنے آجائیں۔ اسی کے ساتھ خاکوں کی نوعیت، موضوع اور اسلوب کا بھی احاطہ ہو جائے اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہیں۔'' (خاکوں کا نگار خانہ، صفحہ: 8) اردو مین تحقیق خصوصا متنی تنقید/ تدوین متن کی نہایت قابل ذکر روایت رہی ہے۔ متنی تنقید کے توسط سے ہی اردو کے کلاسیکی متون کی بازیافت ممکن ہو سکی ہے۔ اردو میں شعری/نثری متون کی ترتیب و تنظیم کا چلن خوب رہا ہے۔ اردو میں بے شمار مرتبہ تصنیفات منظر عام پر آتی رہی ہیں لیکن ان کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ مرتب کے مقدمے یا پیش لفظ سے لگایا جا سکتا ہے۔ حسب حال یہ سوال بھی اہم ہو جاتا ہے کہ مرتبہ کتاب/متن کس قدر اہم یا غیر اہم ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر محمد اشرف نے ''خاکوں کا نگار خانہ'' کی شکل میں ایک اہم تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد عصمت چغتائی کی غیر افسانوی خدمات کے حوالے تحقیق و تنقید کے نئے دریچے وا ہوں گے۔ ڈاکٹر محمد اشرف نے اپنے طویل مقدمہ میں خاکہ، رپورتاژ اور دیگر غیر افسانوی اصناف کے فن اور روایت سے متعلق کچھ نئے تحقیقی گوشوں کی جانب اشارہ کیا

ہے۔ موصوف نے غیر افسانوی اصناف بالخصوص خاکہ اور رپورتاژ کے فروغ میں ترقی پسند تحریک کی خدمات کا بھی مدلل جائزہ لیا ہے۔ دور حاضر کے معروف نقاد و محقق پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے ڈاکٹر محمد اشرف کے تحقیقی ادراک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: ”خاکہ نگاری کی مبادیات اور اس کے ارتقائی تاریخ پر مرتب کی گہری نظر ہے۔۔اس لیے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ ڈاکٹر محمد اشرف نے نفس موضوع کی اہمیت کو نمایاں کرنے میں تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پر خصوصی توجہ دی ہے۔

مطالعہ کا یہ طریقہ جہاں موضوع کی تاریخی روایت کو تازگی عطا کرتا ہے، وہیں علمی و ادبی شخصیت کے ذہنی و فکری برگ و بار کو پروان چڑھانے والے محرکات سے بھی ہمیں واقفیت بہم پہنچتی ہے۔“ (خاکوں کا نگار خانہ، صفحہ: 10-9) ”خاکوں کا نگار خانہ“ کے مشمولات اور ڈاکٹر محمد اشرف کے تنقیدی شعور کے حوالے سے پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کے خیالات ملاحظہ فرمائیں: ڈاکٹر محمد اشرف نے عصمت چغتائی کے خاکوں کے تفصیلی جائزہ میں استدلال سے کام کیا ہے، جس سے ان کے تنقیدی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہیں استنباط نتائج میں در آئے حوالے ان کے تحقیقی درک کا بین ثبوت ہیں۔ موصوف نے عصمت کے مختلف افسانوی مجموعوں یا رسائل میں شائع شدہ بعض افسانوی کو خاکہ یا ذاتی خاکہ دلائل و براہین کی بنیاد پر قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے اس انتخاب کی ادبی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔“ (خاکوں کا نگار خانہ، ص: 12) پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے ڈاکٹر محمد اشرف کی مرتبہ کتاب ”خاکوں کا نگار خانہ“ کی ادبی قدر و قیمت پر معروضی انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ مذکورہ بالا مباحث کی رقشنی میں یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر محمد اشرف کی یہ تحقیقی کاوش عصمت شناسی کی بجھتی ہوئی لو کو مزید تیز کرے گی۔ گرچہ عصمت چغتائی کی تخلیقی شہرت کا بنیادی حوالہ ان کے ناول اور افسانے ہیں۔ لیکن سچائی کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات کے بغیر ان کی تخلیقی کائنات ادھوری رہے گی۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر محمد اشرف کی تحقیقی کاوش ”خاکوں کا نگار خانہ“ اردو کے سنجیدہ حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

کتاب کا نام	:	فکر تونسوی کی ادبی و صحافتی خدمات
مصنف	:	ڈاکٹر رفیق احمد
مبصر	:	ڈاکٹر شکیل احمد
		ڈومن پورہ چنگی مئوناتھ بھنجن
قیمت	:	۳۰۰/روپئے صفحات : ۲۸۸
ملنے کے پتے	:	مکتبہ نعیمیہ اور مکتبہ الفہیم صدر بازار مئوناتھ بھنجن

زیر تبصرہ کتاب مشہور طنز و مزاح نگار (رام لال بھاٹیہ) فکر تونسوی کی جملہ ادبی خدمات کے احاطہ پر مشتمل ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے جس کے مصنف ڈاکٹر رفیق احمد کو ویر بہادر پوروانچل یونیورسٹی جون پور سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ آپ کے مقالہ کے نگراں شبلی نیشنل کالج کے موجودہ صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد طاہر صاحب ہیں۔

زیر تبصرہ مقالہ اب کتابی صورت میں ہے۔ یونیورسٹیوں میں لکھے گئے تحقیقی مقالوں کے بارے میں تحقیق کی دنیا میں برسوں پہلے سے یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ اگر مقالہ تفویض ہونے کے معاً بعد اشاعت کے مرحلے سے گزر جائے تو یقین کر لینا چاہئے کہ تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مقالہ نگار نے دیانت اور ریاضت کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھائی ہے ورنہ سینکڑوں پی ایچ ڈی مقالے اس خوف سے شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ یا روک دیئے جاتے ہیں کہ ان مقالوں میں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جو کسی تحقیقی مقالے میں نہیں ہونا چاہئے اگر وہ شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا تو ریسرچ اسکالر، نگراں اور ممتحن سبھی حضرات کی کارکردگی جگ ظاہر ہو جائے گی۔

ڈاکٹر رفیق احمد کی کتاب "فکر تونسوی کی ادبی اور صحافتی خدمات" تحقیق اور تلاش و تفحص کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے ساتھ ہم اس دعوے کی مکمل تصدیق کرنے کی پوزیشن میں ہیں جس کا ذکر مقالہ نگار نے کتاب کے ابتدائیہ میں ان جملوں میں کیا ہے:

”ہم نے فکر تونسوی کی تصانیف و تخلیقات کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے جن میں فکر کے مقالات و مضامین، شعری مجموعہ، ڈائری، خودنوشت، آپ بیتی اور ناول وغیرہ مطالعہ کا بنیادی جز ہیں....

ناقدین فن، ماہرین علم وادب اور فکر تونسوی کے اہل خانہ واحباب سے سوالناموں، ذاتی ملاقاتوں اور موبائل فون کے ذریعہ رابطہ قائم کیا ہے۔اس طرح ہم نے امکانی وسائل وذرائع اور فن تحقیق کے بنیادی اصول وضوابط اور طریقہ کار کو استعمال کرتے ہوئے (اس بات کی کوشش کی ہے کہ)اس تحقیقی مطالعہ ومقالہ کو اب تک کے مقابلے میں جامع ومثبت انداز فکر کے ساتھ انفرادی نوعیت کا حامل بنانے کی ایک معمولی کوشش کی ہے''۔

بلاشبہ مقالہ نگار نے معمولی نہیں بہترین کوشش کی ہے۔کتاب کا ہر باب اس کوشش کا عمدہ نمونہ ہے۔"حیات وکارنامے والے تحقیقی مقالوں کی ایک خاص ڈگر سی چل نکلی ہے چاہتے تو ڈاکٹر رفیق بھی اس ڈگر پر چل نکلتے۔دو چار کتب خانوں اور کچھ بنیادی ماخذ تک رسائی کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تک رسائی بنا سکتے تھے۔مگر بات وہی ہو جاتی کہ ہم مقالے کو کتابی صورت میں دیکھنے پڑھنے سے محروم رہ جاتے۔

مقالہ نگار درس وتدریس سے وابستہ،محنت وریاضت کے خوگر اور بہت زیادہ پڑھنے کے بعد تھوڑا لکھنے پر عمل پیرا ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کالج کی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ اتنا وقت فارغ کر لیتے ہیں کہ ماشاءاللہ ہر ایک دو برس میں آپ کی کوئی اہم کتاب منظر عام پر آجاتی ہے۔ایک قلم کار کچھ بھی لکھے گا۔مگر "ہوا ہوائی" کبھی نہیں لکھے گا۔یہی وجہ ہے کہ آپ کی اب تک کی مطبوعہ چار کتابیں علمی ادبی اور تحقیقی دنیا میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھی اور استحسان کی نظر سے پڑھی گئیں۔

زیر نظر کتاب میں جہاں فکر تونسوی کے عہد و ماحول کا سنجیدہ جائزہ لیا گیا ہے وہیں پر اردو صحافت کی تاریخ اور رویے کی تفصیل بھی قاری کے لئے پیش کی گئی ہے اس کتاب کے مطالعہ سے جہاں طنز و مزاح کی تاریخ اور نمائندہ قلم کاروں کی خدمات سامنے آتی ہیں وہیں اس صنف کی ہمہ گیریت اور اس کے قبول عام ہونے کا شرح وبسط کے ساتھ جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے اور دوسرے باب میں فکر تونسوی کے حالات زندگی اور اس کے جملہ نشیب وفراز کا احاطہ کیا گیا ہے۔تیسرے باب میں طنز ومزاح نگاری کے فن کا نثری اور شعری تخلیقات کی روشنی میں محاکمہ ہے۔چوتھے اور پانچویں باب میں بالترتیب فکر تونسوی کی طنز ومزاح نگاری اور اردو صحافت کی تاریخ کے جائزے کے ساتھ ان کی صحافتی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔چھٹے باب میں اس فکر تونسوی سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے جنہوں نے ناول نگاری میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے، انشائیہ نگاری میں بھی اپنی شناخت قائم کی۔اور جس شعر گوئی سے انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا اس کی خوشگوار جھلک بھی اس باب میں مل جاتی ہے۔ساتواں باب کسی تحقیقی کتاب کا سفر کہا جاسکتا ہے جس میں پوری کتاب اور موضوع کا نچوڑ جامعیت کے ساتھ موجود ہے اور کتابیات کی وہ فہرست بھی موجود ہے جس سے مقالہ نگار کی برسہابرس کی تلاش وجستجو اور تحقیقی کدوکاوش کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

کتاب کا نام	:	جانِ شوریدہ (غزلیں)
شاعرہ	:	خوشبو پروین
مبصر	:	ابراہیم افسر
		ڈومن پورہ چنگی مئوناتھ بھنجن
قیمت	:	۲۵۰/روپے صفحات : ۱۳۵
اشاعت	:	نومبر، ۲۰۲۳ء
ناشر	:	مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی

نئی نسل کی نسائی شاعرات میں خوشبو پروین کا نام ایک معتبر حوالے کے طور پر اُبھرا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں نسائی جذبات کی جس انداز میں ترجمانی کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔موصوفہ کو شاعری کا شوق وذوق دورانِ طالب علمی سے ہی ہے۔ویسے ان کا رجحان سائنس کی جانب تھا لیکن اپنے چھوٹے بھائی کی شدید خواہش کا احترام کرتے ہوئے انھوں نے اپنے تعلیمی دھارے کا رُخ اُردو ادب بالخصوص شعری تخلیق کی جانب موڑا۔تلکا مانجھی یونی ورسٹی ،بہار سے پوسٹ گریجویٹ کرنے کے بعد انھوں نے حیدرآباد مرکزی دیونی ورسٹی سے ایم فل کیا۔فی الحال موصوفہ دہلی یونی ورسٹی میں پی۔ایچ ڈی کی طالبہ ہیں۔خوشبو پروین اپنے تعلیمی سفر کے بارے میں کہتی ہیں:

دہلی ہے نیا اب کے ٹھکانہ مرا خوشبو
کچھ دن تو گزار آئی ہوں میں ارضِ دکن میں

خوشبو پروین کا رباعیات پر مشتمل شعری مجموعہ ''خوشبو کی آواز ''2018 میں منصۂ شہود پر آچکا ہے جسے قارئین اور ناقدین نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ خوشبو پروین 'پروین شاکر' سے بہت متاثر ہیں۔ انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں ہی ان کے شعری مجموعے 'خوشبو' کا مطالعہ کیا تھا۔ یہیں سے انھوں نے اپنے نام میں 'پروین' کا لاحقہ لگایا۔ 'جانِ شوریدہ' کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں پروین شاکر کا تتبع سلیقگی کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن خوشبو پروین نے اپنے نام 'خوشبو' کو اپنی شاعری میں اشتعارے اور تشبیہہ کے طور پر جا بجا استعمال کیا ہے۔ اس لیے وہ کہتی ہیں:

ہر حرف میں ہر لفظ میں ہر ایک سخن میں
خوشبو کی طرح پھیل رہی ہوں میں چمن میں
سبب شاید کسی کا یاد آ جانا بنا خوشبو
میں خود میں مر چکی تھی پھر سے زندہ ہوگئی ہوں نا

خوشبو پروین نے اپنی شاعری میں ذاتی تجربات ومشاہدات کو نئے لب و لہجے میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ وارداتِ عشق اور وارداتِ قلبی کے اظہار کو رومان کی چاشنی میں ڈبو کر خوشبو پروین نے اپنا حال بیان کیا ہے۔ ان اشعار کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی منزل کو حاصل کرنے کے لیے کیا کیا کاوشیں کی ہوں گی؟ اس طرح کی شاعری وہی انسان کرسکتا ہے جسے مذکورہ باتوں کا ذاتی تجربہ ہو یا وہ ان حدود سے گزر چکا ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

کتنا گہرا دکھ اور کتنے سارے آنسو
من کو جھیل بنا دیں گے کیا کھارے آنسو
کیا اُمید رکھیں اب ساتھ چلتے لوگوں سے
ٹوٹ سا گیا ہے دل ان بدلتے لوگوں سے

اس طرح کی شاعری سے جہاں عنفوان شباب اور کچے عشق کی مہک خوشبو بن کر 'جانِ شوریدہ' میں پھوٹ رہی ہے۔ موصوفہ نے اپنے ابیات میں نسائی جذبات کی ترجمانی بھی تزک و احتشام کے ساتھ کی ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں کم سن اور نوجوان لڑکیوں اور بزرگ عورتوں کے جذبات کو طشت از بام کیا ہے۔ خوشبو پروین کی نظر میں ماں کا احترام ایک تقدیسی عمل ہے۔ انھوں نے ماں بیٹی اور شوہر کی تعظیم کو لازمی قرار دیا۔ ماں کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

خود اپنی ماں کی میں قربانیوں کو سمجھوں گی
خدا کے فضل سے جس دن بنوں گی ماں خوشبو
مہک سے جس کی معطر ہے زندگی میری
وہ میری ماں ہے میری ماں ہے میری ماں خوشبو

نوعمر اور دورِ حاضر کی لڑکیوں کے جذبات کی ترجمانی میں خوشبو پروین نے مجاز لکھنوی کے 'نوجوان خاتون سے' کے مشہور شعر:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

بہرکیف! خوشبو پروین نے 'جانِ شوریدہ' میں نئے لب و لہجے کے ساتھ اپنے جذبات اور کیفیت کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے پیش لفظ 'صدائے دل' میں اس بات کا اعتراف صدق دل سے کیا کہ وہ ابھی طالب علم ہیں اور ان کے شعری مشق کا سلسلہ تاحیات چلتا رہے گا۔ البتہ وہ اس بات کی جانب بھی اشارہ کرتی ہیں کہ شاعری حساس طبیعت کے لوگوں کا کام ہے۔ اس لحاظ سے خوشبو پروین نے جو بھی ابیات 'جانِ شوریدہ' میں پیش کیے وہ ان کے حساس طبع ہونے کے مسلم ثبوت ہیں۔ کتاب کا دیباچہ حقانی القاسمی نے 'جاڑے کی دھوپ جیسی شاعری' عنوان سے رقم کیا ہے۔ حرفے چند پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور دعائیہ کلمات پروفیسر ابوبکر عباد نے رقم کیے ہیں۔ ڈاکٹر زاہد الحق اور سید وقیع منظر نے بھی زیر تبصرہ کتاب پر اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب کا سرورق اعلا اور طباعت عمدہ ہے۔ اس موقع پر میں خوشبو پروین کو 'جانِ شوریدہ' کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ اُردو شاعری میں حقیقی ''خوشبو'' بن کر قارئین کو محظوظ کرتی رہیں گی۔

☆☆☆

بخدمت مدیرِ اعلیٰ، سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ

آداب!

عزیزی شاہد حبیب کے توسط سے این سی ای آر ٹی میں "ادبی نشیمن" کے تازہ شمارے کی غیر رسمی رونمائی کے موقع پر شرکت میرے لیے باعثِ مسرت رہی۔ یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ یہ علمی و ادبی رسالہ نہ صرف اردو زبان و ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنی شناخت قائم کر چکا ہے۔ تازہ شمارے کے مشمولات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ "ادبی نشیمن" کا معیار ہر شمارے کے ساتھ بلند ہوتا جا رہا ہے۔ علمی و تخلیقی مضامین، تحقیقی مقالات اور دیگر مشمولات کی گہرائی اس بات کی غماز ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ مجلہ علمی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کر رہا ہے۔

میں یہ تجویز دینا چاہوں گا کہ رسالے کی ضخامت اور زرِ تعاون میں اضافہ کرتے ہوئے تخلیقی حصے کو مزید وسعت دی جائے، تاکہ نئے اور مستند تخلیقی کاموں کو زیادہ سے زیادہ جگہ مل سکے۔ اس کے علاوہ، میں اس بات پر بھی زور دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "ادبی نشیمن" اپنی علمی و ادبی حیثیت کے باعث یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل ہونے کا مستحق ہے۔ اس حوالے سے ضروری اقدامات کیے جانے چاہئیں تاکہ یہ جریدہ تحقیقی میدان میں مزید مستحکم حیثیت اختیار کر سکے۔ آپ اور آپ کی پوری ٹیم اس کارنامے پر مبارکباد کی مستحق ہے۔ امید ہے کہ "ادبی نشیمن" آئندہ بھی اردو زبان و ادب کی خدمت اسی سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ جاری رکھے گا۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

ڈاکٹر پرویز شہریار

(ایڈیٹر (اردو)، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی)

بخدمت محترم مدیرِ اعلیٰ، ادبی نشیمن، لکھنؤ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بہت مسرت ہوئی کہ سہ ماہی "ادبی نشیمن" (دسمبر 2024 تا فروری 2025) کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حسبِ سابق یہ شمارہ بھی علمی و ادبی مضامین، خوبصورت غزلیات، اور متنوع موضوعات سے آراستہ ہے۔ ہر شمارہ جس محنت اور لگن کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے، وہ اردو ادب سے آپ کی بے پناہ محبت اور اخلاص کا مظہر ہے۔ اس کامیاب اشاعت پر آپ اور آپ کی پوری ادارتی ٹیم کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اللہ کرے کہ "ادبی نشیمن" اسی طرح اردو ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرتا رہے اور اس کی روشنی ہر سمت پھیلتی رہے۔

مخلص

ایس معشوق احمد (کولگام، کشمیر)

محترمی ومکرمی!

اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے ملک کے مختلف شہروں سے متعدد اخبارات و جرائد شائع ہو رہے ہیں، لیکن لکھنؤ، جو علم و ادب کا مرکز رہا ہے، سے شائع ہونے والا سہ ماہی ادبی جریدہ ادبی نشیمن اپنی انفرادیت اور معیاری مواد کے باعث نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ جریدہ مختصر عرصے میں علمی و ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے اور ملک کے گوشے گوشے میں اردو ادب کے قارئین کی علمی و ادبی پیاس بجھانے میں کامیاب رہا ہے۔

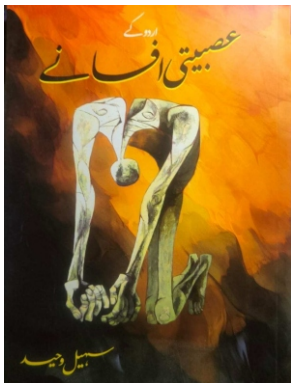
ایڈیٹر جناب ڈاکٹر سلیم احمد اپنی ادارتی ٹیم کے ہمراہ "ادبی نشیمن" کو نہایت محنت و مشقت کے ساتھ مسلسل اور بروقت شائع کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ جریدے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا علمی و ادبی معیار اور بروقت اشاعت ہے، جو موجودہ دور میں کم ہی ادبی جرائد میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مسلسل معیاری مواد کی بروقت اشاعت ایک مشکل کام ہے، جسے "ادبی نشیمن" کی ٹیم نہایت خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔ ۶۸ صفحات پر مشتمل یہ جریدہ واقعی اردو ادب کا ایک آشیانہ ہے، جہاں حمد و نعت، مضامین، غزلیں، افسانے، افسانچے، تبصرے، اور مشہور ادبی شخصیات کی سوانح حیات کو منفرد انداز میں جگہ دی گئی ہے۔ دسمبر 2017 میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا، اور تب سے یہ علمی و ادبی سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رکھے ہوئے ہے۔

"ادبی نشیمن" کے خصوصی شمارے اس کی علمی و تحقیقی گہرائی کی عکاسی کرتے ہیں۔ انور جلال پوری (مارچ تا مئی 2018)، پروفیسر محمود الٰہی (مارچ تا مئی 2019)، گوشہ رشید حسن (دسمبر 2019 تا مئی 2020)، گلزار دہلوی اور راحت اندوری (دسمبر 2020 تا فروری 2021)، فضل امام رضوی، شمس الرحمن فاروقی، اور ظفر احمد صدیقی (مارچ تا مئی 2021) پر مبنی خصوصی اشاعتوں نے اردو ادب میں اپنی شناخت بنائی۔ حالیہ شمارے، جیسے رباعی نمبر (جون تا نومبر 2023) اور شارب ردولوی گوشہ (ستمبر تا نومبر 2024)، بھی قارئین میں بے حد مقبول رہے ہیں۔ "ادبی نشیمن" اپنی معیاری اشاعت اور ادبی خدمات کے ذریعے اردو ادب کے فروغ کے لیے ایک مشعل راہ بن چکا ہے اور یہ جریدہ بلاشبہ اردو کے قارئین اور محققین کے لیے ایک اہم علمی اثاثہ ہے۔

عظمت علی

(جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

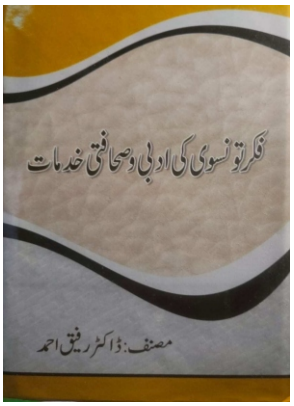
☆☆☆



’’بظاہر ایک دکھنے والا ،ایک ہی صف میں بلا تفریق نماز ادا کرنے والا، ہندوستانی مسلم معاشرہ درحقیقت دو بڑے حصوں اشراف اور اجلاف میں بٹا ہوا ہے۔‘‘اس اقتباس سے شروع ہونے والی سہیل وحید کی کتاب کا نام’’اردو کے عصبیتی افسانے‘‘ہیں۔جس میں معروف افسانہ نگاروں کے 18 ایسے افسانے شامل ہیں جو ذات برادری، اونچ نیچ، اشراف اجلاف اور سماج میں نامساوات اور تفریقی بنیاد پر لکھے گئے افسانے ہیں۔کتاب کی شروعات سہیل وحید نے اپنے تفصیلی اور تحقیقی مقدمے’’اے اہل نظر اے ذوق نظر‘‘ سے کی ہے دراصل اس موضوع پر سہیل کا یہ مبسوط مقدمہ کتاب کا کلیدی حصہ ہے۔

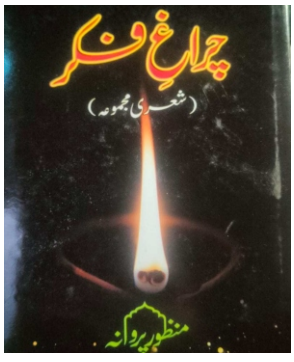
معاشرے میں ذات پات اور اردو میں عصبیتی افسانوں کا یہ مجموعہ بہرحال اردو ادب میں ایک ایسی کتاب ہے جس پر اردو والوں کو توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔کتاب کے منظر عام پر آتے ہی جس قدر پذیرائی ہوئی اس سے محسوس ہوا کہ اردو ادب میں اس موضوع پر کام کرنے کی کتنی ضرورت ہے۔اس کا دوسرا ایڈیشن بہت جلد آنے والا ہے۔اتنے کم وقت میں دوسرا ایڈیشن آنا کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کا ثبوت ہے۔

❁❁❁



رام لال بھاٹیہ کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہے جو فکر تونسوی کی عرفیت کو ہے۔فکر کا نام سنتے ہی دل میں گدگدی سی پیدا ہوتی ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ وجہ ان کی طنزیہ ومزاحیہ کالم ہیں۔فکر تونسوی نے شروعات تو شاعری سے کی اور ناول،تنقید، ڈرامہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی مگر یہ ساری ادبی کاوشیں ان کی طنزیہ ومزاح نگاری کے آگے دب گئے۔ ان کا اخباری کالم’’پیاز کے چھلکے‘‘ کافی مقبول ہوا۔فکر نے طنز ومزاح کو بام عروج عطا کیا جس پر ادب کو فخر حاصل ہے۔فکر تونسوی اردو ادب کا ایسا ادیب ہے جس کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے اور آج بھی لکھے جارہے ہیں۔انہیں میں ایک نام ڈاکٹر رفیق احمد کا ہے۔رفیق احمد کا تعلق مؤناتھ بھنجن سے ہے جو درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ڈاکٹر رفیق احمد نے’’فکر تونسی کی ادبی اور صحافتی خدمات‘‘ پر اپنا تحقیقی مقالہ شبلی نیشنل کالج ،اعظم گڑھ سے ڈاکٹر محمد طاہر صاحب کی نگرانی میں تحریر کیا۔جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔اس میں فکر تونسوی کا عہد،سوانح حیات، اردو میں طنز ومزاح نگاری کی روایت،فکر تونسوی کی طنز ومزاح نگاری،اردو میں صحافت کی مختصر تاریخ اور فکر تونسوی کی صحافت نگاری کے علاوہ فکر تونسوی کی دیگر ادبی خدمات وکتابیات شامل ہیں۔اس طرح فکر کی مختلف ادبی پہلوؤں پر ڈاکٹر رفیق احمد نے تفصیل سے بحث کی ہے۔

❁❁❁



یکتا و بے مثال تو پروردگار ہے
تیرے کرم کی حد ہے نہ کوئی شمار ہے

حمد پاک سے مضمون نگار مبصّر اور شاعر منظور پروانہ کے شعری مجموعے چراغ فکر کی شروعات ہوتی ہے۔اس طرح حمد اور نعت پاک کے بعد غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو 288 صفحات پر ختم ہوتا ہے۔اس سے قبل افسانوی مجموعہ’’دست حنائی‘‘ مجموعہ مضامین’’اعتبار حرف‘‘ اور ادب اطفال پر’’نیکی کا نور‘‘ کو ادبی حلقے میں مقبولیت حاصل ہوچکی ہے۔دراصل منظور پروانہ ایک اچھے نثر نگار ہیں مگر طبیعت کی موزونیت اور شاعروں کی صحبت سے ان کے اندر شعری جراثیم پیدا ہونے لگے لہٰذا شعری محفلوں میں شرکت بھی ہونے لگی۔جس کے نتیجے میں شعری مجموعہ’’چراغ فکر‘‘ منصۂ شہود پر آیا۔مجموعے میں شامل تمام غزلیں روایتی انداز میں خارجیت کا چادر اوڑھے ہوئے ہیں جس سے اشعار میں دلچسپی اور نغمگی پیدا ہوجاتی ہے۔منظور پروانہ لکھنؤ کی تہذیب اور ثقافت کی زندہ مثال ہیں ان کے افکار میں پاکیزگی اور تحریر میں سچائی ہے اور یہی چیزیں ان کی شاعری کو بلندی عطا کرتی ہے۔

❁❁❁

مبصرہ: ڈاکٹر قدسیہ بانو

Peer-Reviewed Journal
Vol: 09, Issue: 01
Dec 2025 to Feb 2026

Urdu Quarterly
Adbee Nasheman
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy: 40/-

(دستاویز)

فاطمہ بی بی

ایک وقت ایسا بھی تھا جب مسلم طبقے میں لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا انہیں صرف مذہبی اور گھریلو تعلیم تک ہی محدود رکھا جاتا تھا۔ایسے ماحول میں اگر کوئی لڑکی تعلیم حاصل بھی کرنا چاہتی تو اس کے لیے تمام طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ایسے ہی موحول میں کیرالا کی فاطمہ بی بی نے سماج کی تمام رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے تعلیم کے میدان میں قدم رکھا اور تعلیم کی بدولت ہی انہیں ہندوستان کی پہلی جج بننے اور گورنر کے عہدے پر فائز ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

سپریم کورٹ آف انڈیا کی پہلی مسلم خاتون جج ہونے کا اعزاز فاطمہ بی بی کو اس لیے حاصل ہے کہ انھوں نے سماج سے بغاوت کر کے تعلیم حاصل کی۔3/وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جو ہندوستان میں گورنر کے عہدے پر تعینات رہیں۔14 نومبر 1950 کو بطور وکیل انہوں نے رجسٹریشن کرایا اور کیرالہ کی نچلی عدالت سے اپنے کریئر کا آغاز کیا۔ جہاں 1958 میں منصف مقرر ہوگئی 1968 میں ترقی ہوئی اور 1974 میں ضلع سیشن جج، جنوری 1980ء میں وہ جوڈیشل رکن کی حیثیت سے انکم ٹیکس سے متعلق اپیل کی ضابطہ کارروائی میں مقرر ہوئیں۔ 4 اگست 1983ء میں ہائی کورٹ کی جج کے طور پر ان کی ترقی کی گئی۔ 14 مئی 1984ء میں ہائی کورٹ کی مستقل جج بن گئیں۔ 29 اپریل 1989ء کو انھیں ہائی کورٹ کے جج کر طور پر ریٹائر کیا گیا لیکن پھر 6 اکتوبر 1989ء کو مزید دو سال کے لیے جج کی حیثیت پر باقی رکھا گیا۔اور یوں ان کی ریٹائرمنٹ 2 اپریل 1991ء میں ہوئی۔اکتوبر 1993 کو قومی حقوق انسانی کمیشن کی رکن رہیں۔پھر اس کے بعد 25 جنوری 1997ء سے 3/جولائی 2001 تک وہ ریاست تاملناڈو کی گورنر مقرر ہوئیں۔

جج میر اصاحب فاطمہ بی بی کیرل کے پتھانام تھٹا میں 30 اپریل 1927 کو پیدا ہوئیں۔ان کی اسکولی تعلیم پتھانام تھٹا کے کیتھیلو کیٹ ہائی سکول سے ہوئی اور گریجویشن یونیورسٹی آف تریوندرم اور لا کالج تریوندرم سے قانون کی پڑھائی کی۔فاطمہ ب بی کا انتقال 23 نومبر 2023ء کو 96 سال کی عمر میں ہوا۔

Printed,Published & Prop. By **Ahmad Rashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow
Editor: Dr. Saleem Ahmad